TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222289

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱ S ح ۳ ۳ ح Accession No. ۱۹۵۳۷

16537

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

بہترین جدید افسانے

ناشر

اردو کتاب گھر

چارکمان، حیدرآباد دکن

دوسری دفعہ

قیمت عالہ

بہترین جدید افسانے

انٹرمیڈیٹ کے اردو پڑھنے والے طلبا کے لیے

ناشر
اردو کتاب گھر چارکمان، حیدرآباد دکن
مطبوعہ
اسلامی پریس بازار نورالامرا، حیدرآباد دکن

فہرست

سلسلہ	افسانہ نویس	افسانہ	صفحہ
(۱)	علی عباس حسینی	میلہ گھومنی	(۱)
(۲)	قاضی نذرالاسلام	مانجھی ایسا گیت نہ گا	(۸)
(۳)	اوپندر ناتھ اشک	ننھا	(۱۸)
(۴)	کرشن چندر	غلط فہمی	(۳۲)
(۵)	احتشام حسین	کھنڈر	(۳۹)
(۶)	رشید جہاں	نئی مصیبتیں	(۴۳)
(۷)	غلام حسین	آنندی	(۵۰)
(۸)	مجنوں گورکھپوری	بیگانہ	(۶۹)
(۹)	راجندر سنگھ بیدی	بھری دنیا میں	(۹۳)
(۱۰)	سدرشن	آزمائش	(۱۰۸)

میلا گھومنی

کانوں کی سُنی نہیں کہتا۔ آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعے کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پڑنی چاہیے، رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا:۔

دو بھائی تھے چتو منو نام۔ کہلاتے تھے پٹھان، مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھی اور دادیہال سید واڑے میں۔ ماں بیچاری آج میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی، ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے بیاہ کر لیا۔ کام کی بیچ اور نشے میں ہاتھ آئے، جیتو تو ... وہ تو بار گاڑی چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے ہی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چتو منو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے۔ بڑے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چیتو زرا ... دبتا تھا۔ ... میر صاحب کے کاروبار میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لا اُبالی تھا۔ ادھر دل کھنچا اکھاڑوں میں، کشتی لڑا کرتا اور ناچ کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں نفسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ زندہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کے کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چتو کو کسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر کے باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح خرمستیاں کرتا پھرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر

میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی، سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے مونگی شکایت کی اور کہا۔ اس لڑکے کو روکو۔ ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قسم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شورِیت پیدا کر دی تھی وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے پچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی اس درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی۔ اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے سادہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا۔

"اچھا! گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کر دوں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی

ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے۔ اُس کی تاریخ یوں بیان کی۔
راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکراین بنی۔ ٹھکراین سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"
ایک صاحب نے پوچھا۔ "اور اس کے بعد"؟
وہ دونوں شلے نے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے۔ تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں! وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی اگر انکار کرتے اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اُسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر اُنھوں نے اُسے نادر شاہی حکم دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہوگا۔"
بچاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی۔ اس لیے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی۔ میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انھیں کا دیا ہے۔ چنو کی نوکری انھیں کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی خود انھیں کے ہیں

غرض گھر آئی اور رات ہی میں مُنّو کو میر صاحب کا فیصلہ سُنا دیا۔ وہ اُسے دِرندی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دِن مولوی صاحب بلائے گئے ممنو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دُلہن کو شاہانہ جوڑا۔ اور چند چاندی کے زیورات اُن کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور اُن کی بیوی نے رُونمائی کے نام سے دس روپے مُنّو کی ماں کو دیئے اور دُلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے "دن بیتتے گئے" مہینے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا مگر مُنّو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا۔ اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے۔ کہ دفعتاً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی آنکلیں۔ معلوم ہوا۔ مُنّو نے مارا ہے۔ پُوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہوا اور جس طرح وہ نشا بیوی پر اُتارتا ہے۔ اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھڑی میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لیکر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی۔ جولاہن سوائے "ممتا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ اُنھوں نے حکم دے دیا "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو مُنّو کی فکر ہو گئی۔ خون، گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے، اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے اس لیے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ " اگر پھر سُنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا اُدھڑ جائے گا۔ ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیجکر کہلا بھیجا کہ " اب اگر مُنّو کو ایک قطرہ بھی پینے کو دیا تو تاڑی خانہ پھنکوا دونگا۔

غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ـــــ اور تاڑی بند ہو گئی ـــ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ـــ اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد، سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا ـــ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں۔ ـــ اور منو بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دئیے تو انھوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزاری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انھوں نے ٹکہ بہ ٹکہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتہً منو کی بیوی [illegible] مرا ہوا بچہ جن کر دولہا کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا

اور سنو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو، غم بھلانے اور جی بہلانے دیوارانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ دردِ دل بیان ہوئے۔ تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحثتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل اب گھر چل! مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے، میں خوش میرا خدا خوش"! ——

چنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور اپنے چار دن بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہو گیا۔

ایک مہینہ بیتا۔ دو بیتے۔ تین مہینے بیتے مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں اُچاٹ آ گئی۔ اکڑنا، برنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہمسایہ صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے۔ ان کو دکھایا۔ انھوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دنوں اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس! چنو کی کمر بھی نکڑ نا کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا۔ مگر افیون کی خشکی نے دبوچا۔ بی چنو امکی بیچتہ

ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی۔ اور یہ چیزیں چار روپے..... میں کہاں نصیب۔ وہ لگا جیسے کال کے ہاتھ پھیلانے اور پیسے مانگنے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا۔ بھادیں نہ سماتا اور افیموں کی لت پڑ ہی چکی تھی۔ وہ چھوٹتی نہیں۔ اُس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور جنوخاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ جنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلہ میں حاضر تھا فوراً اُٹھ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پڑا اسی کے سر پہ بجلی گری۔ مُنہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اُٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں" ارے ماں" چیختا ہوا دوڑا! — راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ دم اکڑتا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا سنبھلتا لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر جھری کے نیچے سے پھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اُس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ جنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

جنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اُس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلا گھومنے الہ آباد چلی گئی۔

مانجھی ایسا گیت نہ گا!

شام کی بھیانک تاریکی میں مجھے چلتے چلتے احساس ہوا کہ جس بدنصیب انسان کی کٹیا میں چراغِ شب روشن کرنے کے لیے کوئی نوجوان دوشیزہ موجود نہ ہو اس کی طرح دنیا میں اور کون بدبخت ہو سکتا ہے۔

سینۂ آسماں میں ایک رخشندہ ستارے نے اشکبار نگاہوں سے مجھے اس بات کا احساس دلایا اور میدان کی خاموش ہوا سنسناتی ہوئی یہ بات کہہ گئی ـــــ شام کا یہی ایک تارا تمہارا دکھ سہتا ہے۔

اور شام کی اس اداسی میں گھر کر اگر کوئی مصیبت زدہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں رختِ سفر باندھے ـــ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ستارۂ شام پارۂ جگر کی مانند تڑپ اٹھے تو وہی جان سکتا ہے کہ اس عالمِ جانکنی میں اس کے ذہن و فکر کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

میں نے ریگستان کی لامحدود وسعتوں میں اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ خاموشی اور سکوت کا یہ عالم ہے کہ دل کی دھڑکنیں بہ آسانی سنائی دے رہی ہیں لیکن نہ جانے کس درخت کی شاخ میں طیور نغمہ سرا ہیں۔ ان کا حسین راگ روئی کے گالے کی طرح اڑ کر میرے خاموش دل کو گدگداتا ہے جوں جوں رات کی جوانیاں باندازِ مستانہ نمودار ہوتی ہیں ستاروں کی نظر فریب ٹولیاں قطار در قطار جیسے فضا میں ملکوتی نغمے بلند کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح میرے ویران دل کے نہاں اندر سے افسانے اور فراموش شدہ کہانیاں طلوع ہوتی گئیں

میرا تمام نظام عصبی صرف ایک دُکھ سے مایل گریہ وزاری ہوتا ہے۔ اور وہ دل کی دبی ہوئی خلش! ایسی جس کا کوئی شمار نہیں۔ بتاؤ خدارا کوئی بتاؤ میں اپنے اس دُکھ کی تلخ اور شیریں کہانیوں کو کیسے بھول سکتا ہوں کالا ناگ جب ہیرا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے تو اس ہیرے کی چمک باہر نہیں جا سکتی۔ ٹھیک یہی حال میرا ہے۔ میں بھی اپنے دل کے ہیرے اور دُکھ کے ٹکڑے کو بھلا نہیں سکا۔

موتی کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ بچپن سے! جب بھونرا سے کلی سمجھ کر مستقبل کا منتظر تھا۔ جب دریائے شباب کی موجیں ہنوز ساکن تھیں۔ جب چاند کی ضیا پاش شعاعیں ہنوز سیاہ بادلوں کے لطیف ٹکڑوں میں جھلمل کر رہی تھیں۔ آہ! وہ بھی کیا دن تھے!

اس کی کٹیا میری کٹیا بالکل متصل تھی۔ ہم ایک دوسرے کو انوکھے طریقے سے پیار کرتے تھے۔ مجھے اسی وقت اس کی موجودگی کی ضرورت پڑتی جب میرے دونوں ہاتھ کسی کو زدوکوب کرنے کے لیے بیقرار رہتے۔ اور میری مار بھی بالکل نرالی تھی۔ بلا وجہ مارنے میں بہت لطف ملتا تھا۔ اور جب واقعی کوئی وجہ ہوتی تو نہ معلوم میرے ہاتھ کیوں رک جاتے۔ اُسے بھی نہ معلوم کیوں میری حرکت سے بہت کچھ انسیت ہو چکی تھی۔ کیونکہ اگر دو ایک دن میں بھول جاتا تو وہ آکر ہنستے ہنستے بولتی "کیوں روٹھ گئے تم۔ دو دن مار جو نہیں کھائی"۔ اور میں پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہتا "نہیں موتی۔ اور اب مجھے مارتے ہوئے شرم سی آتی ہے"۔ یہ کہہ کر میرے سامنے جو عمدہ چیز رکھی نظر آتی میں اُسے دیکر دل کی چنگاریاں سرد کر دیتا۔ تاکہ وہ میری لرزش کو فراموش کر دے۔

کتابوں سے نئی نئی تصویریں کاٹ کر دینا میرا معمول بن چکا تھا۔ کیونکہ میری نگاہ میں یہی سب سے بہترین تحفہ تھا۔ اور مجھے اسکول میں کتابیں ردی کرنے کی

یہ سزا ملتی کہ میں گھنٹوں میز کے اوپر کھڑا رہتا۔

ایک دن میں نے ازراہِ شرارت اس امید میں رونا شروع کیا کہ وہ میرے آنسو خشک کرنے ضرور آئے گی۔ لیکن جب دیکھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تو میں نے اس کے سارے جسم کو اپنی پوری قوت سے جھنجوڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ رونے لگی اور میں...... قہقہہ لگانے لگا۔ جب اس کے آنسو تھمے تو مجھے خشم آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی "توڑ ہی دو نگی تمھاری ساری انگلیاں چھی! شرم نہیں آتی تمھیں۔

اور میں نے اسکی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "پگلی! ذرا سی چوٹ پر بلبلا اٹھی"!

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں نے اس کے بازیچہ خانہ کی سب چیزوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ اور اس نے واقعی میری انگلیوں کو چوبِ خشک سے مجروح کر دیا۔ اس کی حرکت سے غیر ارادی طور پر میرے ہونٹ مسکرانے لگے۔ میری اس مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر میرے پاس آکر بالوں سے کھیلتے ہوئے کہنے لگی "معاف کرنا مجھے سخت ندامت ہے۔ چوٹ تو نہیں آئی؟ — پھر کچھ عرصے کے بعد میرے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی "تمھیں لڑکی بننے کا شوق چرایا ہے شاید۔ ہائے اللہ! اتنے لمبے لمبے بال"!

سنسان راہ کو تھوڑا طے کرنے کے بعد میرا دل پوچھ اٹھتا۔ "ہاں تو اس کے بعد کیا ہوا"

میرے دل کے قصہ گو نے اس خاموش شام کی اداسی میں اپنا افسانہ بھلا دینا چاہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری ساکت زبان کو جنبش ہوئی۔ نہیں نہیں موتی میں نے تم سے اس دن جھوٹ کہا تھا۔ واقعی میں تمہیں چاہتا ہوں" اس کے بعد بھیانک خاموشی میں موسیقی کا راگ جاگ اٹھا۔ اور اس کے سحر آلود سر

دامنِ مشرق سے ٹکرا کر ہنگامہ برپا کرنے لگے۔ اور میری دائمی تشنہ روح بھی اس نشاط انگیز راگ کے تھپیڑے میں مدغم ہو گئی۔

اسی طرح ہمارے دن اور رات گوناگوں عشرتوں میں گزرنے لگے۔ یہاں تک کہ ہوتی دیکھتے دیکھتے ایک دن عالمِ شباب کو پہنچ گئی۔ اب اس کی عمر چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ اور نہ جانے کس طرح اسی الھڑ جوانی میں اسے ٹھیس لگی۔

ٹھیس کی اس شدید ضرب سے وہ تلملا اٹھی۔ اور میرے ہوش و حواس بھی کانپ اٹھے۔ اور فوراً نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اس کپکپی سے میری زندگی کا بہاؤ ساکن ہو جائے گا۔

جب دریا کی غضب ناک روانیاں اپنا ترنگ کھو دیتی ہیں۔ اس وقت اس کے کلیجہ میں گھٹن سی ہوتی ہے اور جب آزادی کے کھلے ہوئے دورے میں زبردستی الجھن آ جاتی ہے تو فوراً اس کے جوش کی مسرت انگیز رفتار سے کشمکش اور جنگ کی بانسری پھوٹ پڑتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب آزادی کو باندھ دینے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو ہماری آزادیاں باغی بن کر تخریب کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں! بتاؤ وہ کون ہے جو دریا کے تھپیڑے کو روک دے۔ کون ہے جو دل کی جولانیاں سرد کر سکے؟

میں اسی پیچ در پیچ تخیل کی دنیا میں سانس لے رہا تھا کہ یکایک ہوا کی تیز روانی یہ بول کر بھاگ گئی ــــ "جس کو تو نے دل میں جگہ دی ہے اُسے بہر حال ڈھونڈنا ہی ہوگا"

اس باغیانہ اعلان سے فریب خوردہ حُسن کا ماتم ہونے لگا۔ اور ٹوٹی ہوئی تمنا اس کی آغوش میں شعاعِ آزادی پھیلا کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی جانِ تمنا کو ڈھونڈنے نکلی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی ــــ "شریکِ حیات

پاکر اپنی راہ بھول جاؤں گی۔" اس آزادی اور بندھن کے احساس نے اس کی چھاتی میں آتشیں لاوے کی دھاریں بہادیں۔ لیکن سماج نے چیخ کر کہا "اپنی اس آزادی کو بالائے طاق رکھ دو ــــــ دیکھو میں یہ دیوار حائل کر دیتا ہوں۔" ان میں سے بہت سی دیواروں کو تو گنگا کی بیتاب موجیں بہالے گئیں۔ مگر پتھر کی اس دیوار کو نہ بہا سکیں۔

سماج کی اس گندی حرکت سے میرے دل کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اور میں سوچنے لگا کیوں نہ اس کی محبت کی آگ پر شبنم کی بوندیں چھڑک دوں۔ کیوں نہ میں اس کی یاد کو دل سے فراموش کر دوں۔ لیکن آہ میں اسے جتنا بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی زیادہ وہ میرے بیکل اور مجروح دل کو اپنی آتشِ محبت سے بھڑکاتی رہتی ہے۔ آخر کیوں؟ یہ میرے جذباتِ مضطرب کشتی کی مانند ہمیشہ لرزاں رہیں گے۔ کیا میں ان بلاخیز ہنگامہ آرائیوں میں گھر کر تا زیست آہ و فغاں کی دلدوز راگنیاں سناتا رہوں گا۔

سمندر کی موجیں دریا کی طرف بڑھیں ــــــ اور دریا نے اسے چھونے کیلئے بے پناہ مشتعل موجوں کے ساتھ بڑھنا چاہا۔ لیکن صد حیف! انجام دونوں کا ایک ہوا یعنی پریشان ہو کر دونوں نے اپنی اپنی موجیں سمیٹ لیں۔ کسے معلوم ان دونوں میں کب اتصال ہوگا۔ کب ہم آغوشی ہوگی۔

اس کے بعد سے ہم دونوں کی ملاقات بند ہو گئی۔ اگر کبھی اتفاقاً گفتگو کا موقع ملتا بھی تو سماج کی سفاک نگاہوں سے بچکر۔ یا نہیں تو دریچے سے جھانک کر! لیکن آہ! اس مختصر سی گھڑی کی دید میرے خرمنِ دل کے خفتہ انگارے کو اور ہوا دے جاتی ہے۔

پانچ سال بعد ــــــ!

ایک دن میں نے سنا کہ اس کی شادی گاؤں کے بڑے زمیندار کے بی۔ اے پاس لڑکے کے ساتھ ہونے والی ہے۔ اور شادی کے ساتھ ہی مجھ مسافر کی محبت بھی

ختم ہو جائے گی۔ اس احساس سے میرے کلیجے میں ایک داغ سا پڑ گیا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ شیشۂ دل کو کوئی پاش پاش کر رہا ہے۔ لیکن جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس کی تاریک زندگی سونے اور چاندی کی حسین آغوش میں کٹے گی۔ تو میں نے اپنی تمام تر خلش کو دھوڈالنا چاہا۔ لیکن پھر یہ دکھ کس لیے۔ آہ! وہ عیش و عشرت کی شاندار عمارت میں دلہن بن کر جائے گی۔ اس کی ساری خواہشیں بات کی بات میں پوری ہونگی۔ سب کچھ ہوگا لیکن میرا یہ بیکل دل مانتا کیوں نہیں۔ آہ میری قسمت!

ان باتوں کو سوچ سوچ کر میری چھاتی درد انگیز راگنی میں حلول ہو جاتی ہے۔ میرے ظاہری و باطنی آلام و مصائب کے نقوش ہویدا ہو جاتے ہیں۔ میں نے فطرت سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ کہے ____

"اپنی خوشی تقسیم کر کے دوسروں سے انتقام لوں گا ___ اور غرور و نخوت میرے سر کو اور بلند کر دیں گے"

"میری رانی سکھی ہو گی" یہی خیال میرے دل پر بار بار ہونگ دلتا رہتا ہے۔ ایک دن یکایک میری چھاتی کے تمام درد دکھ، خلش اور ٹیس سکون و اطمینان سے بدل گئے۔ اور جیسے میری ویران خزاں رسیدہ دنیا میں شانتی کی راگنیاں جھنکار پیدا کرنے لگیں، دیکھ تو ذرا آج مجھے اشک ریزی کرنے کے بعد ایک دنیا ملی ہے۔ جہاں گردش آفاق کے تھپیڑے اور آلام و مصائب کی بے پناہ چیرہ دستیاں معدوم ہیں۔ یہ کسی آرفس کی بانسری کا سحر انگیز راگ ہے جس نے میرے ازلی بیدرد دل کو تھپک کر سلا دیا ہے۔ ہائے اتنے دنوں تک بانسری کی یہ مدھر تان کہاں روپوش تھی!

اس دن میں نصف شب کے عمیق سناٹے میں اس کی یاد سے مجبور ہو کر یہ راگ چھیڑ رہا تھا ___

تمنا کی دنیا میں چھیڑا تھا راگ   کو   بڑی کوششوں سے محبت کو جیتا

دوران نغمہ میں میں نے دیکھا کہ طویل و عریض میدان میں شام کی پرچھائیاں ایک دوسرے میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور دور حدِ نظر ملنے دور مٹی کے مکانوں میں چراغ کے دھوئیں کے نشانات ہوا میں تیر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرا شکستہ دل بارِ غم سے پژمردہ ہو گیا۔ کاش میری کٹیا میں بھی کوئی چراغ روشن کرنے والا ہاتھ ہوتا۔ کیا مجھ بدبخت کی اندھیری کٹیا اسی طرح تاریکی میں سمٹتی رہے گی۔ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ چراغ کے سامنے جو گھونگٹ تانے بیٹھی ہے کاش وہ اپنی دو اشک آلود بیکل آنکھوں کو لے کر میرے قریب آ جائے ۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یکایک جنوبی ہوا سے درخت کا پتہ کھڑ کا اور سُریلی آواز کانوں کو چیر کر چلی گئی ۔ ترا ہی اکھیر امت ۔ اب انتظار کا پھل ملنے والا ہے۔"

اور میرے دل کے تار ایک ساتھ جھنکار کر بول اُٹھے " ان باتوں کو پیچھے سوچ لینا ۔ بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

اس وقت میدان کے چاروں طرف قبرستان کی سی اداسی اور خاموشی پھیل چلی تھی ۔ آلام و مصائب کے ساتھ مقدس محبت مدغم ہو کر میری آنکھوں کی خفتہ پلکوں کو جھنجھوڑ کر چلی گئی ۔

اشک بار آنکھوں کے پردے میں باقی ماندہ تصویر کے نقوش پھر ابھرنا شروع ہوئے ۔ موتی کی شادی کے دن سے کچھ قبل اس کے ساتھ میری آخری ملاقات ہوئی تھی ۔ اور اس نے کہا تھا " میری شادی کی خبر تو تم نے سنی ہوگی ۔ اب کیا ہوگا بولو؟"

میں نے کہا ـــــ " تم سکھی ہو گی ۔"

یہ سن کر جیسے اس کی چھاتی تڑپ اُٹھی ' دل میں ارتعاش پیدا ہو گیا ۔ اور صفحۂ آسمان پر تاروں کی جھلملاتی لڑیاں ایک ساتھ مسکرا اٹھیں ۔ پھر وہ بولی " یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بالم! پھر باتیں کیسے ہونگی؟ اتنے دن کے بعد میں نے اس

کی شیریں آواز کی میٹھی بانسری سنی۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی پتلیاں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ ماتم کناں ہے۔

میں نے کہا "موتی میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن یاد رکھو جس کے ساتھ تمھارا ازدواجی رشتہ قائم ہونے والا ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ تمھاری عزت کریگا تمھیں سکھی رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھے گا ـــ وہاں جا کر میری تمام باتیں بھول جاؤگی"

کہنے کو تو یہ کہہ گیا لیکن پھر سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ اہل ثروت ہے، خوبصورت، تعلیم یافتہ ہے ـ لیکن اس کی محبت مجھ سے فوقیت لے جائے گی، یہ غیر ممکن ہے۔ ان باتوں کو سوچ سوچ کر میرے دل کے شعلے یکجا ہو کر آتش نشاں بن گئے۔ اور میں جیسے اس میں جھلس گیا۔ مدہوش شرابی کی طرح اس نے میری انگلیوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے دباتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں!

اور میں نے بیتاب ہو کر کہا "موتی! ایسا ہو کر رہے گا۔ مجھ سے جدائی اختیار کرنا ہی پڑے گی"

اس وقت میرا دل غرور و نخوت سے کانپ اٹھا اور وہ پھر گویا ہوئی۔

"ظالم! بھول گئے وہ دن جب تمھارا ظالم ہاتھ میری پشت پر ہوا کرتا تھا آج بھی مار و اسی طرح" کتنے دنوں کی کتنی گذشتہ باتیں میرے صفحہ دل میں نمایاں ہو گئیں۔ اور اسی وقت فخر و غرور کا دستِ چالاک خودی کو ابھارنے لگا۔ "فاتح ہونا ہی ہوگا"

میں نے ہنستے ہوئے موتی سے کہا "موتی! اگر تمھیں یاد نہیں تو آج حقیقت کھول دیتا ہوں۔ مجھے تم سے محبت نہیں"

اس بات کی خلش میرے دل کو روندگئی۔ اور ہرنی کی طرح چمک کر بولی "کیا کہا؟"

میں نے کہا "ہاں موتی اتنے دنوں تک تمھیں فریب میں رکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک دن بھی تمھارے ساتھ محبت نہیں کی"

یہ سن کر وہ گرجتے ہوئے بولی "جاؤ دور ہو جاؤ مجھے بھی تم سے محبت نہیں تم جلاد ہو، قاتل ہو بے دل ہو جاؤ ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔ تمھاری شکل سے اب دلی نفرت ہو گئی ہے۔ بہت توہین کی تم نے میری محبت کی!! اب میں برداشت نہیں کر سکتی!"

یہ کہہ کر وہ فوراً میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اور میں نے سنا کوئی چکرا کر آنگن میں دھڑام سے گر گیا۔ اور اس کے حلق سے یہ آواز نکلی "ماں"!

دریا کے اس پار ایک مانجھی درد انگیز گیت گا رہا تھا۔ میں نے بھی اس کے سُر میں سُر ملا کر گانا شروع کیا"

مانجھی! ایسا گیت نہ گا ——— دل ہے شیشہ چُور نہ کر!"

میری اس غم سودہ اور غمگسار زندگی کو جس میں اضمحلال اور افسردگی کی برف جم گئی ہے یا تو ساحل میں لا کھڑا کر، نہیں تو اپنی تیز رفتار موجوں میں بہا لیجا!

دل کے اندر مُرجھائے ہوئے پھول کی جو غمناکی حلول کر گئی ہے کیا موتی نے اُسے سمجھا ہے یا نہیں۔

جس کو میں نے اپنے تخیل سے اچھوتا خیال کیا، اپنی خودی سے زیادہ محبت کی ——— اس کو تحفۂ درد دینے کیلئے جب میں نے اپنی چھاتی کا کانٹا پیش کیا اس وقت نہ جانے کیوں میرے دل و جگر کے اندر کھٹک اور چبھن سما گئی تھی۔ لیکن آہ! وہ نہ سمجھ سکی۔ میرا دل جس لالہ رُخ کے حُسنِ جہانتاب پر قربان ہوتا ہے اگر وہ "پھول" کو اپنا انیس بنا لے تو بتاؤ میں کس طرح اس جبروت سے بچ سکوں گا۔ میری وہ زندگی جو خون، آنسوں اور آگ کے چشموں میں غوطہ زن ہے ——— اس کی کامیابی کدھر روپوش ہے۔ صد حیف اس سے بڑھ کر شوریدگی میرے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔

موتی کی شادی ہو گئی۔ وہ دیکھو اس کا مرمریں محل جس کے اندر لاتعداد شمعیں ضوفگن ہیں۔ اور ایک میری کٹیا ہے جو تاریکی کے اندھیرے دامن میں لپٹی ہوئی ہے۔ یکے بعد دیگرے گھر کے تمام چراغ شام ہوتے ہوتے روشن ہو جائیں گے لیکن صرف میری کٹیا چراغ کی روشنی سے محروم رہے گی۔۔

ننھّا

اُنھوں نے کہا "تانگا آگیا ہے۔ وقت کم ہے۔ جلدی اُٹھو" اور یہ کہہ کر وہ سامان اُٹھا اُٹھا کر نیچے لے جانے لگے۔"

بیماری کی تھکن نے میرے جسم کو بے طرح کھوکھلا کر دیا تھا میں بڑی مشکل سے اُٹھی۔ اندر بستر پر میرا ننھا پھول سُکھ کی نیند سو رہا تھا۔ پلکونکی پنکھڑیاں تھیں اور ننھی ننھی لٹیں پیشانی پر بکھر رہی تھیں۔ اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے بے اختیار اسکے گرم گرم ہونٹوں کو چوم لیا۔ بچہ ایکبار چونکا۔ پھر کروٹ بدل کر سو رہا۔

کتنی بار میں نے ان بکھرے پیارے بالوں پر محبت کا ہاتھ پھیرا تھا کتنی بار ان نرم نازک رخساروں کو ہونٹوں سے دبایا تھا۔ کبھی اس طرح گلے میں گولا سا آکر اٹک گیا تھا۔ کبھی آنکھیں یوں نہ چھلچھلائی تھیں۔ خیال آیا۔ نہ جانے پھر کب اس ننھی مُنی صورت کو دیکھنا نصیب ہوگا۔ ہوگا بھی یا یہ حسرت دل میں لیے ہوئے ختم ہو جاؤنگی اور ایک بار اسے گود میں لے کر چوم لینے کو دل بیقرار ہوگیا۔ میں جھکی ہی تھی اُنھوں نے آکر کہا "کیا کرتی ہو۔ جاگ اُٹھیگا" اور پھر میری ساس کی طرف دیکھکر بولے "ماں جی اب ننھا تمھارے حوالے ہے۔"

میں بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن گلے نے ساتھ نہ دیا۔ پرنم آنکھوں سے

ایکبار اُن کی طرف دیکھ کر میں نے اُن کے قدموں پر سر جھکا دیا۔

ساس نے کہا۔" پرتمار کشا کرے گا بیٹی۔ میں تو اس سے دعا کرتی ہوں کہ تم جلد تندرست ہوکر واپس آؤ اور اپنے لال کو سنبھالو"

پھر وہ آگے آگے چلے اور میں چپ چاپ اُن کے پیچھے پیچھے آنسو پونچھتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

ساس بھی ہمارے ساتھ آئی۔ تانگے میں سوار ہونے سے پہلے ایک فوری جذبے کے ماتحت میں اس سے لپٹ گئی۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اپنی مرحوم ماں کی تصویر پھر گئی۔ میں نے ساس کو اور بھی زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور سسکیاں اپنے آپ میرے ہونٹوں سے نکلنے لگیں۔

ساس کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ دوپٹے کے آنچل سے اُن کو پونچھتے ہوئے اُنھوں نے مجھے تانگے میں بیٹھنے کو کہا۔

دوسرے لمحے گھوڑے کے ٹاپوں سے رات کا سناٹا چونک اٹھا۔

سنگدل، بےحس اور ٹھنڈی سڑک، سوئے یا کسی کی یاد میں کھوئے ہوئے اُداس مکان اور کسی نامعلوم خوف کی طرح دنیا میں چھا جانے والی سردی اُنھوں نے خاموشی سے شال کو اور بھی اچھی طرح میرے گرد لپیٹ دیا۔

میں آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ سناٹا، نیند، تاریکی اور ایک سنسان سڑک ــــ فٹ پاتھ پر ایک دریدہ اور بوسیدہ لحاف اوڑھے ایک بھکاری لڑکا سو رہا تھا۔ میرے دل میں اس بے بس یتیم کیلئے ہمدردی کا سمندر اُمڈ آیا اور پھر ایک بے ماں کے بچے کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی ...... پھول سے گال مرجھا گئے ہیں، ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں، آنکھیں ہیں کہ حسرت کے مدفن ہیں ــــ بے چین سی ہوکر

میں نے کہا۔ "ذرا تانگا روکنا"

"کیا بات ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ایک فقیر لڑکا اتنی سردی میں پٹڑی پر سویا پڑا ہے۔"

لیکن اس دوران میں تانگا بہت دور نکل آیا تھا۔ میں نے اس رخصت ہوتے ہوئے منظر کو ایک نظر دیکھا۔ دور سامنے ایک مکان کے اوپر سے غروب ہوتا ہوا چاند جھانک رہا تھا۔ اداس اور غمگیں۔ گویا اپنی اس شناسا دنیا کو چھوڑتے ہوئے اسے دکھ ہو رہا تھا اور اس کی پھیکی روشنی میں وہ بدقسمت بھکاری ایک سیاہ دھبا سا بن کر رہ گیا تھا۔

بائیں طرف ایک مکان کی بالائی منزل سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی اور کسی ماں نے تھکی خمار آلود اور بوجھل آواز میں کہا "سو جا میرے لال"۔ بچہ نہ جانے کیوں اور بھی زور سے رو رہا تھا۔ اسی وقت کسی بڑھیا کی کرخت آواز سنائی دی۔ "سو جا بھی کمبخت سب کی نیند حرام کر دی"۔

میرا کلیجہ دہل پڑا۔ پھر گھر کا تمام نقشہ میری آنکھوں کے سامنے گزر گیا۔ میرا لال رو رہا ہے۔ "ماں" "ماں" کہکر چلا رہا ہے اور میری ساس اسے جھڑک جھڑک کر سلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں لوٹ جانے کے لیے بیقرار ہو اٹھی۔ میں نے کہنا چاہا۔ "تانگا روکنا"

تانگا خود ہی رک گیا۔ سٹیشن آگیا تھا اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی کا انجن "شاں" "شاں" کر رہا تھا۔

انھوں نے قلی کو آواز دی اور بازو تھام کر مجھے اتارتے ہوئے کہا "قلی ادھر ٹرنک رکھ دیتا ہے۔ تم اس پر بیٹھو شیل، باقی سامان دھیان سے اتروا لینا۔ میں دوڑ کر ٹکٹ لے آؤں۔ وقت کم ہے۔"

میں کہنا چاہتی تھی "میں واپس جاؤں گی۔ آج نہیں کل چلیں گے۔" لیکن کہتی کس سے وہ تو ٹکٹ لینے چلے گئے اور قلیوں نے سامان اُتار کر رکھنا شروع کر دیا۔

تانگے والے نے کہا "دیکھ لینا بی بی اور کوئی چیز تو نہیں رہ گئی" میں جیسے خواب سے جاگی۔ اتنے میں وہ بھی آ گئے۔ سامان کو دیکھ کر انھوں نے تانگے والے کو پیسے دیے اور کچھ دیر بعد گاڑی ہمیں اپنی گود میں اُٹھائے لیے جا رہی تھی۔

موت اور اس گاڑی میں اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں کہ موت خاموشی سے آتی ہے اور یہ شور مچاتی ہوئی ورنہ بے حسی اور سنگدلی میں یہ اس سے کم نہیں۔ کروڑوں مسافر اُس نے ایک جگہ پہنچائے ہیں۔ کبھی کسی کی جدائی پر آنسو نہیں بہائے۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ جو اس کی گود میں بیٹھی جا رہی ہے۔ شاید اپنی زندگی کے آخری سفر پر ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر اس کی زندگی سے ناامید ہو چکے ہیں۔ شاید یہ پھر اس کی گود میں بیٹھ بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن اسے کیا.....

دُور درختوں کی چوٹیوں پر چاند چمک رہا تھا۔ اس کی ضیا اور بھی پھیکی اور مٹیالی ہو گئی تھی۔ اچانک ایک ننھی سی صورت چاند میں نمودار ہوئی اور اس نے پکارا "ماں"

"ماں"

"ماں"

میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے کی سیٹ پر اپنے خیالات میں محو خاموش بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "آپ نے یونہی اتنی جلدی کی۔ ایک دن اور ٹھہر جاتے تو کیا تھا" لمحہ بھر کے لیے وہ پلک جھپکے بغیر میری طرف دیکھتے رہے اور پھر میرے پاس آ بیٹھے۔ میرے سر کو اپنے مضبوط سینے سے لگا کر انھوں نے کہا "شیل تم کیسی باتیں کر رہی ہو"

میرے آنسو شاید اُن کی اس بات کا انتظار کر رہے تھے۔

× × × ×

قہقہہ لگاتے ہوئے انھوں نے کہا "نبیل اگر تم روز اسی طرح کڑھا کرے گی تو آرام کیسے آئے گا۔"

لیکن میں نہیں ہنسی۔ میں نے کہا "میں منت کرتی ہوں۔ مجھے ننھے کو لاکر دکھا دو۔"

وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے کہا۔ "تم دوسروں کی مشکل کو تو محسوس نہیں کرتیں۔ بچے کو یہاں لانا اتنا سہل نہیں۔ جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے اُسے لانا چاہوں گا تو ماں کو بھی ساتھ لانا پڑے گا اور تمھیں معلوم نہیں۔ ماں ایکدن کیلئے بھی گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ میری کا امتحان ہے اور پھر شمیم کو بھی گھر میں تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اب تمھیں کیسے سمجھاؤں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئے اور میں نے بھی آنچل میں اپنا منہ چھپا لیا۔ آج دو ماہ سے میں ہسپتال میں پڑی تھی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے ننھے کی یاد ستاتی تھی۔ صرف اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ہمیشہ کیلئے تو اپنے پاس نہ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہ ہورہی تھی۔

باہر سڑک پر ہارن بجاتی ہوئی موٹر نکل گئی اور آہستہ آہستہ چلنے والے کسی تانگے کے پہیوں کی آواز آرہی تھی۔

میں نے آنکھیں پونچھکر دور وارڈ کے آخری کونے میں چارپائی پر پڑی ہوئی کامنا کی طرف دیکھا۔ دو ماہ سے وہ بھی ہسپتال میں پڑی تھی۔ اور شائد تبھی سے ایک بچی گھر میں اس کی راہ تک رہی تھی اور کامنا شائد زندگی ہی سے نا اُمید تھی۔ شائد وہ جانتی تھی کہ اس کی بچی ماں کو پھر کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اور اور کبھی کبھی وہ مایوسی کی حد تک پہنچ کر نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے شوہر سے

کہہ اُٹھتی تھی "مجھے منی کو دکھا دو"

کا منا کمبل اوڑھے چپ چاپ پڑی تھی۔ نہ جانے وہ سوئی ہوئی تھی یا جاگ رہی تھی اور اگر جاگ بھی رہی تھی تو نہ جانے وہ عالم بیداری میں ہی اپنی بچی کو پیار کر رہی تھی۔

دو ماہ پہلے کا ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ تاریک رات کو بے پناہ چیخ کی طرح چیرتی ہوئی، گاڑی لاہور پہنچی تھی۔ اور ہسپتال میں داخل کرانے سے پہلے اُنھوں نے مجھے ایک دوست کے گھر ٹھہرایا تھا۔ انارکلی کے نزدیک ہی گنپت روڈ پر ان کا مکان تھا۔ جس کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ کافی کھلا اور روشن تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر تانگوں کے اڈے تک آتے آتے نڈھال ہو گئی تھی۔ اگرچہ کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہ چاہتا تھا تو بھی ان کے اصرار سے دودھ کے دو چار گھونٹ پی کر بستر پر دراز ہو گئی تھی۔ میرے آرام کا انتظام کر کے وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے باہر چلے گئے تھے۔ اور میں کھڑکی کے باہر نیلے وسیع آسمان کو تاکتی لیٹی رہی تھی۔ باہر سے کچھ عجیب طرح کا ملا جلا شور کانوں میں آرہا تھا — موٹروں، تانگوں، بیل گاڑیوں، خوانچے فروشوں اور راہگیروں کا — لیکن اس سارے شور و شغب میں کبھی کبھی ایک دلکش آواز سنائی دی جاتی تھی۔ جیسے کوئی دھیرے سے میرے کان میں کہہ رہا ہو — "ماں" — اور میں تپ سی جاتی تھی۔

دوپہر کو گھر کی مالکن — ان کے دوست کی بیوی — میرے پاس آ بیٹھیں۔ بیچاری بڑی اچھی تھیں میری بیماری کے سلسلے میں مجھ سے پوچھنے لگیں۔

میں نے کہا۔ "پتہ نہیں چلتا۔ کیا بیماری ہے۔ معلوم نہیں ہسپتال سے زندہ بھی لوٹونگی یا نہیں۔"

وہ مسکرائیں ـــــ آج بھی وہ مسکراہٹ میری آنکھوں میں ناچ جاتی ہے ـ بولیں " گھبرائیں نہیں ـ بخار کی کیا بات ہے ...... ایک طرح کا ہوم یہی سمجھے ـ میری نند کو سال بھر بخار آتا رہا ـ ڈاکٹروں نے تو ڈرا ہی دیا تھا ـ لیکن پتا نے بھلا کیا ـ جگر کا بخار تھا ـ ڈیڑھ برس بعد کامل آرام آگیا اور اب تو وہ دو بچوں کی ماں بھی ہے ـ ایشور نے چاہا تو آپ بھی جلد تندرست ہو جائینگی ـ"

اسی وقت ایک چھوٹا سا بچہ ـ "ماں" "ماں" ـ کہتا ہوا آیا اور ان کے گلے سے لپٹ گیا ـ

دوسرے دن مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ـ میں نے سُکھ کا سانس لیا اگر ان کے دوست کے ہاں کچھ دن اور رہنا پڑتا تو نہ جانے میری کیا حالت ہوتی ـ جب بھی وہ گول مٹول خوبصورت چمکیلی آنکھوں والا آتا تو میرا دل اسے گود میں لے کر پیار کرنے کیلئے تڑپ اُٹھتا ـ

کشادہ صاف اور روشن کمرہ شیشے کی طرح چمکتا ہوا فرش سفید پالش سے دمکتی ہوئی کرسیاں ـــــ مجھے ہسپتال کی فضا بُری نہیں لگی ـ لیکن اس روشنی اور اور پاکیزگی کے باوجود اس فضا میں جو ایک طرح کی کٹھورتا جس کی کمی سی ہوتی ہے ـ اس کی طرف میں نے توجہ نہیں دی اور ننھے بچوں کی دنیا سے بہت دور ـــــ کامل سکون پاکر میں مطمئن ہوگئی تھی ـ لیکن اس دو ماہ کے قلیل عرصے میں ہی میں بیس بیس لمبے چوڑے کشادہ کمرے سے اُکتا گئی تھی ـ ذرا بھی تو اپنا پن نہ تھی اس میں اور میں چاہتی تھی اپنے چھوٹے سے گھر کا آنگن ـ اس میں اپنے ننھے کا شور اس کی کلکاریاں پیار محبت رد ٹھنے اور منانے کی وہ پُر شور دُنیا ....

کا منا نہ جانے کب دھیرے سے اُٹھ کر دیوار کا سہارا لیتی ہوئی میرے پاس آگئی اور اس نے میری نم آلود آنکھوں کے سامنے ایک فوٹو رکھ دیا ـ

"شیلا یہ میری منی کی تصویر ہے ـ"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد، پیلے چہرے پر ایک بہشتی مسرت کھیل رہی تھی۔

"خوبصورت ہے" میرے بھرے ہوئے گلے سے صرف اتنا ہی نکلا۔

جب کامنا چلی گئی تو میں نے نم آلود آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور نہایت التجا آمیز لہجے میں کہا: "ایک بات مانو گے"

"کہو"

"ننھے کو نہیں لا سکتے تو اس کا فوٹو ہی لا دو"

ایک لمحہ کیلئے ان کا چہرہ اُداس ہوگیا۔ پھر مسکرا کر اُنھوں نے کہا۔ "اچھا لا دونگا"

میں نے پوچھا "یہ چہرہ کیوں اُداس بنا لیا آپ نے"

وہ ہنسے "میں سوچتا ہوں۔ تم تندرست نہ ہو سکو گی۔ تمھاری صحت اچھی ہو رہی ہے دو ایک ماہ تک گھر ہی تو جاؤ گی۔ یہاں بیٹھی اس کا فوٹو دیکھکر روتی رہا کرو گی۔

شام کا وقت تھا۔ دور کسی بڑی عمارت کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعیں کھڑکی سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ میں کھڑکی کی جالی سے گال لگائے کب سے بیٹھی اُن کا انتظار کر رہی تھی ننھے کی کئی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے آئیں اور چلی گئیں تصور ہی تصور میں میں نے اُس سے باتیں کیں اُسے پیار کیا۔ چوما اور پھر گلے سے لگایا۔ ساڑھے پانچ بجنے کو آئے۔ میرے گال پر جالی کے نشان بن گئے۔ راستہ تکتے تکتے میری آنکھیں دکھنے لگیں میں نے اپنا سر کھڑکی سے ہٹا لیا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ دوسری مریضاؤں کے رشتے دار آکر جانے بھی لگے۔ لیکن ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ آج اُنھوں نے ننھے کا فوٹو ساتھ لانے کو کہا تھا۔ آج میں صبح ہی سے شام ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ منٹ منٹ گن کے بڑی مشکل سے دن کاٹا تھا۔ جب گھڑی نے چار بجائے تھے تو میرا دل خوشی سے

دھڑکنے لگا تھا۔لیکن پانچ بجتے بجتے میری خوشی ہلکے سفید بادلوں کی طرح غم کے آسمان کی گہرائیوں میں تحلیل ہونے لگی۔اور اب جی...... چاہتا تھا زور زور سے چیخیں مار مار کر رو پڑوں یہ چادر تار تار کردوں اور پاگلوں کی طرح باہر سڑک پر بھاگ جاؤں....

لیکن اُس وقت کامنا کی بوا نے آواز دی "کیوں شیلا کیا حال ہے "

میری آنکھیں پُر نم تھیں۔میں نے چادر سے انھیں پونچھا۔

"کہو تمہارا ننھا تو اب اچھا ہے "

گھبرا کر چادر ہٹاتے ہوئے میں نے پوچھا "کیوں اُسے کیا ہوا تھا "

کامنا کی بوا ہمارے ہی شہر کی تھی۔میں تو اُسے نہ جانتی تھی۔لیکن وہ ہمارے سب گھر والوں سے واقف تھی۔بولی "ننھا کئی دنوں سے بیمار ہے "

میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور بھی گھبرا کر میں نے کہا "مجھے تو انھوں نے بتایا تک نہیں۔ابھی اُس دن تو وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔کہتے تھے۔بالکل تندرست ہے۔پہلے سے موٹا ہو گیا ہے اور اب تو بیٹھنا بھی سیکھ گیا ہے۔

اور میں نے تجسس بھری نگاہیں کامنا کی بوا کے چہرے پر جما دیں۔

لیکن بوا نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔کچھ اور بھی سنجیدہ ہو کر بولیں۔

"میں کئی دنوں سے محلے میں گئی بھی نہیں۔اب اچھا بھی ہو گیا ہو گا۔"

اور پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے کہا "کہو اب تمہارا کیا حال ہے"

میں نے کہا "پہلے سے اچھی ہوں "لیکن......

لیکن اس سے پہلے کہ میں ننھے کے متعلق کچھ پوچھتی۔کامنا نے اپنی بوا کو آواز دی اور چلی گئی۔

کھڑکی کے باہر تاریکی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔میں نے ایک بے چین نگاہ

اور پیڑوں اور پودوں سے گھری ہوئی سڑک پڑی ہے...... اگر وہ اور بیس منٹ تک نہ آئے تو ہسپتال کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ پھر آیندہ ہفتہ تک ان کے آنے کی راہ دیکھنی ہوگی۔ پہاڑ سے سات دن کاٹنے ہوں گے۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ میرا دل پھر بھر آیا۔ اچانک میں نے دیکھا۔ پھاٹک کو پار کرکے وہ تیز تیز بھاگتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ میں جلدی سے پھر لیٹ گئی اور میں نے چادر سے اپنی چھلکتی ہوئی آنکھوں کو ڈھک لیا۔

"شیل!"

"شیل!"

"شیل!"

اُنھوں نے زبردستی میرا ہاتھ میری آنکھوں سے ہٹا لیا۔ نہ جانے وہاں کب کب کے آنسو جمع تھے۔ لاکھ پونچھتی تھی۔ پھر بھی بہے چلے آتے تھے۔ آخر انھوں نے اس تاخیر کی صفائی دینا شروع کی "ننھے کے فوٹو کی وجہ سے میں پہلی گاڑی سے رہ گیا۔ کیا کرتا۔ فوٹو گرافر نے ابھی تک تیار نہ کیا تھا میں جاکر سر پر سوار ہوگیا تو بڑی مشکل سے اُس نے تیار کرکے دیا پھر بھی دوسری گاڑی چھوٹ چکی تھی..... لاری میں آیا ہوں...... اور میرے آنسو خود بخود تھم گئے۔ ایک بار آنچل سے آنکھیں پونچھ کر میں اُٹھ بیٹھی "کھنچوا لائے فوٹو، دکھاؤ تو"

اُنھوں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "رو کیوں رہی تھیں؟"

میں نے کہا "فوٹو دکھائیں آپ" اور ان کے ہاتھ سے فوٹو چھین لیا۔ ایک ہونڈھا اُلٹا کرکے رکھا ہوا تھا اور اس میں بٹھا کر ننھے کا فوٹو لیا گیا تھا۔ محبت کے جوش میں میں نے اُسے چوم لیا اور پھر سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔

اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بڑا بھاری بوجھ دل سے اُتر گیا ہو۔ گویا میلوں کی مسافت طے کر کے منزل پر پہنچ گئی ہوں۔

آج یہاں میرا آخری دن تھا۔ صبح ہی سے میری طبیعت کچھ بھاری ہو رہی تھی۔ دل مسرت اور غم کے کچھ عجب طرح کے ملے جلے جذبات سے معمور تھا۔ سرائے میں بھی چار دن رہو تو کمرے سے محبت ہو جاتی ہے اور آدمی رخصت ہوتے وقت دیواروں پر ہی ایک حسرت بھری نظر ڈال لیتا ہے۔ ہسپتال میں تو چار دن نہیں، چار ماہ بسر کئے تھے وہاں تو جان پہچان والی بے جان دیواریں ہی نہ تھیں۔ نرسیں تھیں ڈاکٹر تھے اور پھر وہ بیمار عورتیں تھیں۔ جن سے ان بیماری کے دنوں میں کچھ بہناپا سا ہو گیا تھا۔

میں دن بھر سب سے رخصت ہوتی رہی۔ کاملا صبح ہی سے بیہوش تھی، اس کی بچی کا فوٹو اس کے سینے پر پڑا تھا۔ زندگی کے ان آخری دنوں میں اس کی محبت اس کا پیار، اس کے سب ارمان، اس کی اس ننھی سی بچی میں مرکوز ہو گئے تھے۔ جب وہ ہوش میں ہوتی تھی تو اس کے دھیان میں ڈوبی ہوتی تھی "مردوں کی کیا بات ہے" وہ کہا کرتی تھی "ایک بیوی گئی تو دوسری آجائیگی شاید پہلے سے اچھی ہو۔ لیکن بچوں کو تو ان کی ماں نہیں ملتی" اور شاید وہ سچ کہتی تھی۔ اس کے بستر کے پاس کھڑے میں نے اس کی طرف دیکھا اپنی بچی کی تصویر کو اپنے سینے پر رکھے وہ بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ دل ہی دل میں میں نے پرماتما کا شکر ادا کیا، کہ اس نے میرے بچے کو بے ماں کا ہونے سے بچا لیا۔ اپنی موت اور اس کے بعد بچے کی حالت کا تصور کر کے ہی میرا دل کانپ جاتا تھا۔ بس میں چاہتی تھی کہ کاملا کو ہوش آجائے تو اس سے دو باتیں کر کے، اسے تسلی دے کر، اس سے رخصت ہو لوں لیکن اسے ہوش نہ آیا اور ادھر

وہ مجھے لینے آپہنچے۔

گرمیاں ابھی شباب پر نہ آئی تھیں۔ لیکن درختوں کے سائے پیارے لگنے لگے تھے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہسپتال سے باہر نکل کر میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ ایک مٹیالے رنگ کا کبوتر شیشم کے پتوں میں چھپا غٹر غوں، غٹر غوں کر رہا تھا اور ہسپتال کی فصیل پر دو ممولے پھدک رہے تھے۔ میں نے مسرت کی جھرجھری لی۔ سب کچھ نیا نیا سا لگ رہا تھا اور میں محسوس کرتی تھی۔ جیسے میں کسی دوسری دنیا سے لوٹ آئی ہوں۔

لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے ہم ان کے دوست کے ہاں بھی گئے۔ ان کی بیوی نے اسی میٹھی مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا۔ اصرار کرنے لگیں کہ دو چار دن لاہور ٹھہر جاؤں انھوں نے بھی کہا کہ اب جب اتفاق سے آئی ہو تو دو چار دن ٹھہر کر کچھ دیکھ لو۔ پھر نہ جانے کب آنا ہو۔ لیکن میں نمانی گھر کی مالکن سے گلے ملی اور پھر آنے کا اور انھیں کافی دان تک تنگ کرنے کا وعدہ کر کے چل پڑی۔ انار کلی کے سرے پر بساطیوں کی دکانیں دیکھ کر مجھے ننھے کے لیے کھلونے لینے کا خیال آیا۔

انھوں نے کہا۔ گاڑی سے رہ جاؤ گی۔ وہاں کھلونے کیا کم ملتے ہیں۔"
لیکن جتنی دیر میں وہ تانگا کرتے۔ میں نے کھلونے خرید لیے۔

میرے پاس آکر وہ ہنسے "ساری دکان ہی جھولی میں رکھ لی کیا۔ چلو تانگا آگیا ہے" اور بساطی کو پیسے دے کر مجھے کندھے سے تھامے وہ تانگے تک لے آئے۔ اسٹیشن پہنچے تو گاڑی تیار تھی۔ بھاگ کر بیٹھے کہ چلدی۔

کئی بار جذبات کی شدت کے باعث باتیں کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ گاڑی چلی جارہی تھی اور ہم دونوں چپ بیٹھے تھے۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں

کہہ سکتی۔ لیکن میں بہت کچھ سوچ رہی تھی ۔ بچے کی قدر مجھے ہسپتال ہی میں جاکر معلوم ہوئی تھی ۔ زندگی کی تمام روشنی جب موت کے عمیق غار کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ جب سب ارمان، سب تمنائیں سب خواہش اس اندھیرے میں کھو جاتی تھی تو ایک ننھی منی سی کرن ساتھ ساتھ چلی آتی ہے ۔ گاڑی کے اس ڈبے میں بیٹھے بیٹھے کامنا کی صورت میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی اور دل ہی دل میں اُس بدنصیب بچی کیلئے پرماتما سے دعا کرکے میں نے اپنے ننھے کی غور و پرداخت، تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بیسیوں سکیمیں بنا ڈالیں ۔

گاڑی کے ہچکولوں سے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونی لگی ۔ کھانا بھی جی بھر کر کھایا تھا اور پھر شروع گرما کی دوپہر! کچھ دیر بعد میں وہیں کونے سے سر لگائے سو گئی ۔

"شیل اٹھو اسٹیشن آگیا ہے ۔"

آنکھیں ملتے ہوئے میں نے انگڑائی لی ایک دیوار ہماری گاڑی کے ساتھ چلی جا رہی تھی اس کے پرے بے شمار لائینیں ۔ ان پر کھڑے ان گنت ڈبے اور پھر شنٹ کرتے ہوئے انجن ۔ آخر پلیٹ فارم پر جاکر گاڑی رک گئی ۔

میں خوش خوش اُتری ۔ گھر پہنچی تو ساس نے نیچے آکر خیر مقدم کیا ۔ مجھے گلے سے لگایا اور ایک لمبی سانس لی ۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھیں بھر آئی تھیں ۔

میں نے آہستہ سے پوچھا "ننھا کیا سو رہا ہے ؟"

لیکن شائد انھوں نے میری بات نہیں سنی ۔ اُن کے ہاتھ سے سامان لیکر وہ اوپر جانے لگیں ۔ جاتے جاتے انھوں نے اُن سے کہا "بہو کو نیچے بیٹھک میں بٹھاؤ ۔ میں اُوپر ذرا جھاڑ دے رہی ہوں ۔"

بیٹھک میں جاکر میں کوچ میں دھنس گئی ۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگے ۔ لیکن میں زیادہ دیر تک بیٹھی نہ رہ سکی ۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا

ننھے کو دیکھ آؤں۔ وہ رُکے۔ ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ایک نامعلوم سے شُبہ سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بھاگ کر اور انھیں دونوں کندھوں سے قریب قریب جھنجھوڑتے ہوئے میں نے پوچھا "ننھا کہاں ہے"

اُنھوں نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ انگیٹھی پر دیوار کے سہارے ایک بڑے چوکھٹے میں جڑی ہوئی۔ ننھے کی تصویر رکھی تھی اس کا بڑا سائز جو وہ مجھے ہسپتال میں دے آئے تھے۔

"ننھے کا اب یہی کچھ رہ گیا ہے شبل ...."

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ رومال سے چہرے کو ڈھانپ کر جلد جلد دوسرے کمرے میں چلے گیے۔

غلط فہمی

جن لوگوں کے متعلق عوام غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ ان میں ایک میں بھی ہوں۔ کہنے کو تو میں ایک گھٹیا سے کالج میں رذیل قسم کا پروفیسر ہوں۔ پچھتر روپیہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور سارا دن ایف۔ اے کے لڑکوں کی انگریزی املا درست کرنے میں گزرتا ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ میرے گاؤں کے لوگ، میرے معمولی واقف کار اور چند وہ پرانے احباب جو کبھی ایف اے یا بی اے میں ہم جماعت تھے۔ اور اب کسی دور افتادہ شہر میں پرائیویٹ فرم میں کلرکی کی آسامی پر سڑ رہے ہیں، مجھے کسی فلم کے ہیرو سے کم نہیں سمجھتے۔ اگر گاؤں والوں میں سے کسی کی پیشی لاہور کی کسی کچہری میں پڑ جائے تو وہ کم بخت وہیں گاؤں والوں سے میرا لاہور کا پتہ پوچھتا آتا ہے۔ اور پھر نہایت فخر سے تانگے والے کو کہتا ہے۔ "چل ۴۷ بسنتر جنگ محلہ پروفیسر صاحب کی کوٹھی جانا ہے" گویا سارے لاہور میں ایک میں ہی پروفیسر رہ گیا ہوں۔ اور وہ جو گنجے سروں والے پانچ سو روپیہ پاتے ہیں، محض جھک مارتے ہیں اور نرے چور ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ازکم میری دو تین تنخواہیں انہی بن بلائے مہمانوں کی خاطر تواضع میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور جس کا صلہ مجھے صرف اتنا ملتا ہے کہ واپس گاؤں جاکر میرے متعلق شیخیاں بگھاری جاتی ہیں۔ "میں وہاں لاہور پیشی تھی۔ گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کے گھر پر ٹھہرا تھا۔ انھوں نے میری بہت بہت خاطر کی۔ دو دن ہلنے نہ دیا۔ بہت سعادت مند ہے۔ غرور نام کو نہیں چھو گیا۔"

گو میری تنخواہ صرف پچہتر ہے ۔ مگر سوائے چند ایک دیرینہ احباب کے ہر شخص کو میری تنخواہ کے متعلق بھی غلط فہمی ہے ۔ وہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ میں خدا نہ کرے کم از کم دو ڈھائی سو تنخواہ پاتا ہوں ۔ اس کا تذکرہ نہایت حاسدانہ لہجے میں کیا جاتا ہے ۔ جسے سننے میں اگر مجھے کوفت بھی ہوتی ہے تو ایک قسم کی مسرت بھی ۔ مثال کے طور پر بازار میں چلتے چلتے کوئی پرانے ہم جماعت مل گئے ۔ اچھی طرح سے مصافحہ ہوا اس کے بعد "یار" سنا ہے کہ تم پروفیسر ہو گئے ؟ گویا یقین نہیں آتا ۔ 'یار' سن کر بڑی مسرت ہوئی (پروفیسر میں بنا اور مسرت اُن کو ہوئی) 'یار خوب عیش کرتے ہو نا' (یعنی خدا تمھیں غارت کرے !) اور ڈھائی سو روپیے تنخواہ پاتے ہو ۔ ذرا میری طرف دیکھو ۔ لدھیانے میں کھرڈر برڈ کمپنی میں پینتیس روپیے تنخواہ لیتا ہوں ۔ ایک بیوی ہے اور دو بچے ۔ جان ضیق میں ہے ۔" تم تو عیش کرتے ہو یار" دو ڈھائی سو روپیے تنخواہ غرضیکہ احباب "دو ڈھائی سو روپیوں" کا ذکر اس دلی خلوص اور یقین کے ساتھ کرتے ہیں کہ اکثر مجھے بھی اطمینان سا ہو جاتا ہے اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ واقعی میری تنخواہ اتنی ہی ہے ۔ مگر جب مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے تو یہ دلفریب سراب پارہ پارہ ہو جاتا ہے ۔

بعض لوگوں نے میری علمی قابلیت کے متعلق مختلف نظریے قایم رکھے ہیں اور میری ہزار کوششوں پر بھی وہ ان نظریوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں گاؤں والے خصوصاً یہ سمجھ چکے ہیں ۔ کہ دنیا بھر کے علوم و فنون جانتا ہوں اگر کسی کو آپریشن کرانا ہو ۔ اگر کسی کا مقدمہ ہو کسی کو دستے کی بیماری ہو کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو ۔ وہ فوراً لاہور آ کر مجھ سے صلاح طلب کرتا ہے ۔ اور مجھے چار و ناچار جھوٹ بولنا پڑتا ہے ۔ اول تو سچ سننے کو کوئی تیار نہیں اور پھر

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر لوگ آپ پر خواہ مخواہ ایمان لے آئیں تو موسیٰ بننے میں کونسی دقت رہ جاتی ہے اور پھر میں تو کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا عدم تشدد کے فلسفے، بورڈنگ کی روٹیوں اور غلط املا سے بھری ہوئی کاپیوں نے مجھے بے حد بزدل بنا دیا ہے۔

بعض افراد کے نزدیک میرا پروفیسر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ میں لاہور کے سب بڑے بڑے حاکموں، نوابوں، رئیسوں اور یونیورسٹی کے ممتحنوں کو جانتا ہوں۔ کوئی چاہتا ہے کہ میں ڈپٹی کمشنر سے اس کی ملاقات کرا دوں۔ کوئی کسی بیمہ کمپنی میں نوکری کا متلاشی ہے کوئی نواب جھنگڑ خاں کی کوٹھی کی تعمیر کرانے کا ٹھیکا مانگتا ہے اور مجھ سے انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک سے ہاں کر دیتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تو بلا ٹل جاتی ہے۔ بعد میں بہت باتیں گھڑنا پڑتی ہیں۔ مگر بعد میں۔ یہی غنیمت ہے۔

ابھی اس دن کا واقعہ ہے۔ میرے دوست شیر علی خاں بلوچ تشریف لے آئے شاید تیسری جماعت میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ اب اتنے سالوں بعد آج ملاقات ہوئی کہنے لگے "آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں شیر علی خاں بلوچ ہوں میں آپ کے ساتھ تیسری جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ یاد آیا؟

خوب یاد آیا۔ یہ وہی صاحب تھے۔ جو اکثر میرے بستے سے لے لیا کرتے تھے۔ میری جیب سے بوٹیاں نکال کر کھا جایا کرتے تھے۔ مذاق مذاق میں مجھے اسکول کے باہر گندی نالی میں گرا دیا کرتے تھے۔

اوہو! آپ ہی شیر علی خاں ہیں! میں نے خوش ہو کر کہا "کہیے مزاج کیسے ہیں سوڈا وڈا منگواؤں؟

سوڈا وغیرہ تو بعد میں پی لوں گا شیر علی خاں نے کہا میں نے سنا تھا کہ آپ یہاں پروفیسری کرتے ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ آج کل نارمل کا امتحان دے رہا ہوں۔ جغرافیے

کا پرچہ بہت برا ہوا ہے پاس ہونے کی مطلق امید نہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کے پاس چلوں۔ آپ خان بہادر رج کو تو جانتے ہوں گے۔ اگر مل ملا کے کام ہو جائے"

میں نے دل میں سوچا۔ کہاں خان بہادر رج ـــــ اور کہاں میں نہ ہی تو میں ان کو جانتا ہوں اور نہ ہی ملنے ملانے سے یہ کام ہو سکتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ میں ذرا بزدل واقع ہوا ہوں۔ اس لیے میں نے جھٹ کہہ دیا "یہ تو معمولی سی بات ہے خان بہادر رج ـــــ کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ ابھی کل ہی میرے ہاں چائے پینے آئے تھے کاش آپ اُس وقت آجاتے۔ خیر کوئی بات نہیں"

خدایا تیرا ہزار ہزار شکر۔ شیر علی بلوچ نے گرج کر کہا " آپ پھر ان سے ملیں گے نا۔ میرا رول نمبر لکھ لیجیے۔ نمبر ۳۶ ہے ۳۶ بھولیے گا نہیں"

کبھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ۳۶ نمبر مجھے اچھی طرح یاد رہے گا۔ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کل ہی خان بہادر کو کہہ دوں گا۔

اچھا تو میں چلتا ہوں۔

واہ صاحب۔ آئے بھی اور چل بھی دیے۔ ایک دو دن تو ٹھہریے۔ ضرور ٹھہرنا۔ ضرور ٹھہرنا۔ شیر علی خاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مگر دوسرا پرچہ ہے۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔

شیر علی خاں چلے گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کم از کم میرے ذہن سے تو یہ واقعہ بالکل اتر گیا لیکن ایک روز کیا ہوا۔ کہ عین راستے گیارہ بجے کسی نے زور سے دروازہ کھڑکھڑایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا شیر علی خاں تھے " آئیے آئیے" میں نے بناوٹ کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

شیر علی نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ میں اسی بات کے لیے حاضر ہوں کہیے کچھ بنا؟ سب کام ٹھیک ہو گیا۔ آپ تسلی رکھیں۔ میں نے اسی دم جھوٹ موٹ کہا۔

کیا انھوں نے مجھ کو پاس کر دیا۔

ہاں ہاں۔ میں خان بہادر کے پاس گیا تھا۔ وہ کہنے لگے۔ آؤ یار مدت کے بعد آئے ہو۔ میں نے کہا ایک لڑکے کو پاس کر دیجیے۔ چنانچہ اُنھوں نے بیس نمبر اور دے دیے۔ اندر تشریف لائیے نا۔ میں نے شیر علی خاں سے کہا۔

میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ شیر علی خاں نے کہا۔ میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھول سکتا۔

کس کا احسان دوست! میں نے انکساری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ یہ تو ایک بالکل معمولی سی بات تھی۔

ہاں تو مگر آپ کو ٹھیک پتہ ہے نا۔ شیر علی خاں نے کہا بیس نمبر دیے تھے۔

ہاں ہاں پورے بیس۔

میرا رول نمبر تو آپ کو یاد تھا؟ بھلا کیا تھا؟ شیر علی خاں نے کہا۔

یہی نمبر — نمبر — (کم بخت یاد نہیں آتا) یہی نمبر ۳۷ تھا۔

نمبر ۳۷ شیر علی خاں بلوچ نے چیخ کر کہا۔ میرا نمبر تو ۳۶ تھا۔

ہاں نمبر ۳۶۔ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اف کتنی غلطی ہوئی۔ میں نے ۳۶ کو ۳۷ سمجھ لیا۔ شیر علی خاں بولے میں نے آپ کو اسی وقت کہا تھا کہ آپ میرا رول نمبر لکھ لیں مگر آپ نے نہ لکھا۔ نمبر ۳۷ والا تو پہلے ہی بہت لائق لڑکا ہے۔

اوہو ٹھیک یاد آیا۔ میں نے جلدی سے جواب دیا کتنی بھول ہوئی تبھی تو خان بہادر کہنے لگے۔ اس لڑکے کو پہلے ہی بہت نمبر ملے ہیں۔ تم اُسے بیس نمبر اور کس لیے دلانا چاہتے ہو۔ کیا اسے یونیورسٹی میں اول کرانا چاہتے ہو۔ تو میں نے کہا تھا۔ خان بہادر صاحب آپ اُسے میری خاطر بیس نمبر اور دے دیجیے۔ اف اب خیال آتا ہے نمبر ۳۷ تھا کتنی غلطی ہوئی

پھر؟ شیر علی خاں نے پوچھا۔

آپ مطلق فکر نہ کریں۔ میں نے اُسے تسلی دے کر کہا۔ کل ہی خان بہادر کے ہاں

جا کر اُنھیں حقیقت سے واضح کر دونگا۔ اور اس لڑکے کے بیس نمبر کاٹ کر آپ کو دے دیے جائیں"

شیر علی خاں چلے گئے۔ اور میں پھر اس واقعہ کو بھول گیا۔ ایک مہینے کے بعد اچانک مجھے شیر علی خاں کا خط آیا۔ وہ پاس ہو گیا تھا۔ اور اس نے میرا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔

شیر علی خاں کے اس واقعہ کے بعد لوگوں کو پورا یقین ہو گیا ہے کہ یونیورسٹی میری زرخرید غلام ہے۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے ماموں مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ امسال عزیز پرکاش چند نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ انگریزی اور حساب کے پرچے اچھے نہیں ہوے۔ یوں تو جماعت میں خاصا لائق سمجھا جاتا ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہیں فیل نہ ہو جائے۔ اس کا زرا خیال رکھنا اور ممتحنوں سے مل کر ____

میں نے سر ہلا کر کہا۔ اوہ۔ بالکل فکر نہ کریں۔ پرکاش ضرور پاس ہو جائے گا۔

اس کے بعد ماموں جان کے کئی خط آئے۔ اور ہر خط میں یہ فقرہ ہوتا تھا "میں نے وہ بات جو آپ کو لاہور میں کہی تھی۔ اس کا دھیان رکھنا" اور کبھی کبھی مامی جان بھی لکھ بھیجتی تھیں "پرکاش کا خیال رکھنا۔ پرکاش گویا تمھارا اپنا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر تم نے اس کو پاس نہ کرایا تو میں ساری عمر تم سے نہ بولوں گی" وغیرہ وغیرہ۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پرکاش چند پاس ہو گیا۔ بس اب میرے ماموں سب کو سناتے پھرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے پاس کرایا ہے۔ آخر اپنے عزیزوں کو اتنا بھی فایدہ نہ ہو تو اور کیا ہو گا۔ اور ادھر جب پرکاش چند ایف اے میں داخل ہونے کے لیے آیا۔ تو میں نے تہدید کے انداز میں اس سے پوچھا۔ کیوں بے پرکاش، تو ہسٹری کے پرچے میں کیا اوٹ پٹانگ لکھ آیا تھا۔ اکبر کی جگہ اشوک اور وارن ہسٹنگز کی جگہ لارڈ ڈلہوزی کا عہد حکومت کیوں لکھ دیا۔ پھر انگریزی کے پرچے میں تیرے ہجے اتنے غلط کیوں تھے۔ عزیز کام کرنا سیکھو۔ ورنہ ہر سال تو میں پاس کرانے سے رہا۔

اور بیچارے پرکاش چند نے سر جھکا کر کہا۔ جی غلطیاں کیا بتاؤں ہو ہی گئیں۔

مگر لڑکے ہر بار پاس نہیں ہوتے۔ تو میرے پاس اس کے لیے بھی گھڑے گھڑائے جواب موجود ہیں۔

اجی آپ کا لڑکا کیا پاس ہوتا۔ آپ نے تو الٹا مجھی کو شرمندہ کرایا۔ میں لالہ ایشری پرشاد کے پاس گیا۔ تو انھوں نے فوراً سب پرچے میرے ہاتھ میں دے دیے اور کہا تم خود ہی انصاف سے جتنے نمبر چاہو دے دو۔ اب میں کیا کرتا۔ کچھ ہوتا۔ تو نمبر دیتا جو جواب دیکھو غلط۔ املا غلط ہجے، معانی غلط۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ لڑکا سارا سال کیا کرتا رہا ہے کرتا کیا رہا ہے؟ لڑکے کا باپ چھڑی ہاتھ میں لے کر جواب دیتا ہے۔ بدمعاش کہیں کا سارا سال تاش کھیلتا رہا۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ یہ پاس کیسے ہوتا۔ کیوں بے حرامی!

اب اسی طرح سے کئی لڑکوں کو پٹوا چکا ہوں۔ پھر بھی لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے میں نے تنگ آ کر پروفیسری چھوڑ دی ہے۔ اب میں انارکلی میں آٹے، تیل، لون کی دکان کرتا ہوں۔ مگر اس پر بھی لوگوں کی غلط فہمی دور نہیں ہوئی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ابھی تک پروفیسر ہوں اور اس دکان پر یونہی چلا آتا ہوں، یا شاید یہ میرے کسی دوست کی دکان ہے۔ اگر میں کسی کو سچی بات بتا بھی دوں۔ تو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اس لیے خوب کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہا! ہا!
پروفیسر صاحب آپ تو نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔
اس دنیا میں سچائی جھوٹ ہے اور جھوٹ سچائی ہے۔

کھنڈر

شہر سے کوئی میل بھر فاصلے پر ایک بہت بڑی عمارت کا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا غریب کی جھونپڑی کی طرح ویران اور مزدور کی جیب کی طرح خالی، مگر جیسے غریب کے جھونپڑے میں کبھی کبھی زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور مزدور کی جیب میں چند پیسے آجاتے ہیں اُسی طرح اس کھنڈر میں بھی ایک بوڑھا فقیر رات کاٹنے کے لیے آجاتا تھا، وہی اس کا تنہا مالک تھا۔ شاید کسی زمانے میں اس عمارت کی ملکیت کے لیے جھگڑے ہوئے ہوں لیکن اب تو فقیر اس پر پوری طرح قابض تھا کبھی کبھی وہ کالا کلتا بھی آ آتا تھا جو بھکاری کی جمع کی ہوئی چیزوں میں شریک ہو جاتا تھا۔

قصے تو بہت مشہور تھے لیکن ٹھیک پتا نہ تھا کہ یہ کس عمارت کا کھنڈر ہے۔ بوڑھے اور جوان اس کے متعلق کم باتیں کرتے تھے لیکن بچے ہر زمانے میں یہ جانتے کہ اس میں بھوت رہتے ہیں، اس پر جنوں کا قبضہ ہے، اسی لیے کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا جس راستے سے گزر کر وہ کھنڈر ملتا تھا وہ بھی سنسان تھا۔ چرواہوں کے لڑکے اپنے جانوروں کو اُدھر نہ جانے دیتے تھے اور بچے ادھر کھیلنے کے لیے نہ نکلتے تھے لیکن وہ بوڑھا بھکاری دن بھر کی محنت کے بعد اُسے رات میں ضرور آباد کرتا۔ کم لوگوں نے اُسے اس محل سرا سے نکلتے یا اس کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ اور کبھی صبح کے اندھیرے میں یا رات کی تاریکی میں دیکھا بھی تو جن یا بھوت سمجھا۔

کھنڈر کی دیواروں پر گھاس اُگی ہوئی تھی، زیادہ حصہ گر چکا تھا، اونچی نیچی زمین ہر برسات میں اپنی شکل بدلا کرتی تھی لیکن اس عظیم الشان عمارت کا وہ گوشہ

جس میں بھکاری کی راتیں بسر ہوتی تھیں ایک ہی حالت پر قایم تھا، تقریباً دس بارہ فٹ لمبی چوڑی چھت بوسیدہ لکڑیوں پر ٹکی ہوئی تھی، موسم کے لحاظ سے بعض مہینوں میں سورج کی روشنی اور چاند کی کرنیں اس کے اندر تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ ویسے بھکاری کو کبھی چراغ جلانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ خبر نہیں وہ کب سے اس کھنڈر میں رہتا تھا۔ شاید اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اس نے یہیں بسر کیا ہو۔ ممکن ہے کبھی انھیں تاریکیوں میں اُس کی جوانی کی راتیں رنگین بنی ہوں، کون جانتا ہے؟ مگر اب وہ بالکل بوڑھا تھا۔ مرنے کے قریب۔

اور پاس ہی ایک برگد کا سوکھا درخت بھی اس کھنڈر کی طرح ویران، اور خشک تھا، اس کی ایک اونچی شاخ پر ایک بڑا گدھ بیٹھا ہر وقت اُونگھا کرتا تھا، دوسرے تیسرے دن وہ کہیں جاتا اور پھر اسی درخت پر آ جاتا، وہ بھی اس بھکاری کی طرح اکیلا تھا۔ کھنڈر، بھکاری، درخت اور گدھ، جیسے یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتے تھے، سب ضروری تھے اگر وہ کھنڈر نہ ہوتا تو بھکاری کہاں جاتا، اگر بھکاری نہ ہوتا تو پھر اس کھنڈر کی ضرورت ہی کیا تھی، اگر درخت نہ ہوتا تو اس کھنڈر کی ویرانی پوری طرح محسوس نہ ہوتی اور پھر گدھ کہیں اور رہتا اور اگر گدھ نہ ہوتا تو یہ درخت بیکار تھا یقیناً ان سب میں فرسودگی کی جھلک کے باوجود کوئی کہانی تھی جو کہے جانے کی محتاج تھی۔

کیا اس کھنڈر میں جوان مرد اور حسین و جمیل عورتیں کبھی نہ پھرتی رہی ہونگی؟ کیا اس سوکھے درخت میں کبھی پتیاں اور پھل نہ رہے ہوں گے کہ اس مردار خوار گدھ کے علاوہ دوسری چڑیاں بھی اپنا آشیانہ اس میں بناتیں ـــــ کیا معلوم! شاید رہا ہو، مگر اس سے کیا ہوتا اب تو اس کھنڈر میں ایک بھکاری رہتا تھا جو دن بھر دو ایک ٹکڑے روٹی کے لیے مارا مارا پھرتا اور رات کو آ کر اس میں آرام کرتا۔ اور اس درخت پر ایک گدھ تھا جو مردہ جانوروں کے انتظار میں بیٹھا اونگھا کرتا۔

جاڑوں کی ٹھنڈی ہواؤں سے بچنے کے لیے اور بارش سے محفوظ رہنے کے لیے بھکاری اس ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے چلا جاتا اور گرمی کی نکھری ہوئی چاندنی میں چھت کے باہر نکل کر سوتا مگر گدھ کو ہمیشہ ایک ہی جگہ بیٹھا ہوا دیکھا گیا، دونوں ایک دوسرے کی طرح بھی تھے اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔

بھکاری بوڑھا اور کمزور ہوتا چلا گیا، اب کوئی دن ایسا بھی گزر جاتا تھا کہ وہ باہر نہ نکلتا۔ اگر پچھلے دن کی بچی ہوئی روٹیاں ہوتیں تو کھا لیتا ورنہ فاقے سے پڑا رہتا اور تیسرے دن بھوک سے مجبور ہو کر پھر نکل پڑتا۔ اُس سے چلا نہ جاتا تھا مگر چلتا تھا اُس سے بولا نہ جاتا تھا مگر بولتا تھا، اُس میں شہر تک جانے کی ہمت نہ تھی مگر جانا ضروری تھا، واپس آنے کی سکت نہ تھی مگر واپس آنا لازمی تھا، شہر کی تمام عمارتیں اپنی عظمت اور ہیبت سے ڈرا کر اُسے اپنے یہاں جگہ دینے سے انکار کرتی تھیں۔

جاڑے ہی سے اُس کی بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر وہ شہر آتا جاتا تھا۔ دو تین دروازے ایسے تھے جہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا تھا۔ پہلے وہ اُن دروازوں سے پا جانے کے بعد بھی سارے شہر میں مانگتا پھرتا تھا مگر اب اُس کی طاقت جواب دے چکی تھی، وہ کم سے کم پر اکتفا کرتا تھا اور اُٹھتا بیٹھتا اپنے کھنڈر میں واپس آ جاتا تھا۔ گرمی آتے آتے اُس کی ساری قوت ختم ہو گئی اور تین دن تک وہ کہیں نہ جا سکا، چوتھے دن پھر اُس نے ہمت کی اور دن بھر شہر میں چکر لگاتا رہا، رات کو واپس ہوا تو تیز بخار سے اُس کا جسم بھن رہا تھا۔ اب تک اُسے کھنڈر میں روشنی کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی تھی مگر آج اس کی نگاہ کام نہ کرتی تھی، اُسے ہر جانب روشنی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی ناچ رہی تھیں اور طبیعت میں ہیجان تھا، رات کو دیر گئے چاندنی پھیلی، بھکاری بخار کی گرمی سے لوٹتا ہوا چھت کے نیچے سے باہر آ گیا۔ یہ اُس کی آخری رات تھی۔

صبح ہوئی تو گدھ نے پَر پھڑپھڑائے اُس نے کبھی کسی انسان کو کھنڈر میں اس طرح پڑے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کی غنودگی ختم ہوگئی اور وہ اُڑ کر مردے کی طرح پڑے ہوئے بھکاری کے قریب آیا، بھکاری نے بے چینی سے ہاتھ پیر پھیلائے گدھ نے اپنی چونچ اُس کے جسم پر ماری، بھکاری نے درد سے جلد جلد کروٹیں بدلیں، گدھ اُڑ کر اپنی جگہ پر چلا گیا لیکن اب وہ اونگھ نہیں رہا تھا، اُس کی نگاہیں بھکاری پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دن بھر تڑپا کیا اور رات کو کھنڈر بے مالک کے رہ گیا۔

صبح کو گدھ پھر نیچے اترا اور تھوڑی دیر میں بہت سے گدھ جمع ہوگئے اب وہ درختوں پر بیٹھ کر اونگھنے والے کمزور جانور نہ تھے، اُن میں زندگی تھی، اُن میں آواز تھی، اُن میں لوٹنے والوں کی خودغرضی تھی، وہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

نئی مصیبتیں

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچازاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئی تھیں۔

"شاید بارہ روپے پونڈ تھا۔ کیوں نا اماں جان؟" وہ ساس کے لیے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔"

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔" صغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں بچوں کے سب جمپر اونچے ہو گئے۔ اب مسز رابرٹ کو اون لا کر دیا ہے کہ ان کے سوئیٹر بُن دیں۔ بڑی مشکل ہے۔

"آپ کو کیا مشکل پڑے گی تو بے چاری نرس ——" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور موقع پر بغیر چوٹ کیے نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ وہ سال میں دو تین جمپر یا پُل اوور بُن لیں اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بُنتی؟" بھابی عطیہ نے چیخ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔ تاکہ مجھے جواب کا موقع ہی نہ ملے اور بقول صغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی شائستہ لڑائی نہ ہو۔ اماں کو صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں۔ "سچ تو ہے، اون بہت مہنگا ہو گیا ہے اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی اپنے لیے ایک جمپر بنا لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آتشدان کے سامنے اپنی سفید بلی کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ادھر بلی اونگھ رہی تھی۔ اُدھر چچی اماں لیکن نہ معلوم کس طرح صغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے بولیں "لاؤ گی کہاں سے؟ آج کل لڑائی کے زمانے میں اون رہا ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی!"

"کیوں ابھی صبح ہی تو آپ دُکان سے لے کر آئی ہیں اور اب کیا دن بھر میں ساری دُکانیں خالی ہوگئیں"۔ چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ جانے دیتے تھے۔

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔

"میں نے کب کہا تھا کہ دُکانیں خالی ہوگئیں"۔

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں"۔ چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ کوئی نیا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب بھی ساس کی دستِ نگر تھیں اور اب تو اور بھی زیادہ۔ ان کے اوپر روپے کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار گزرتا تھا۔ اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ ان کو بالکل ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے!"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا؟ ...... صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا......"

"اے ہے ابا جان سنئے بھی دیکھیے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہوگئی ہے"۔

چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لیے تیار ہونے چلے گئے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا "خیر تم مت لینا۔ مجھ کو تو اون چاہیے ...... میں ضرور خریدوں گا......"

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں ....." لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اون نا پید ہو گیا ہے۔ چچی اماں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا کہ سننے والے کو ترس آجائے۔ آج ہی صبح میں، بھابی عطیہ، اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپئے سے زیادہ کا اون لیکر آئے تھے۔

"اون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اجڑ گئی ہے۔" میری اماں نے رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان نے کہا۔ اب جارجٹ کے دام ہی دیکھ لیجیے۔ پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپے گز بہت اچھی جارجٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپیے گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں اتنے تھوڑے کپڑے مسوری میں بنائے، اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں۔"

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تو آپ نے ہمارے ہی سامنے خریدی ہوں گی! اور کوٹ ......" میں بیچ میں بولی۔

"لو وہ بھی کوئی ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ۔"

"نوکروں کو وردیاں ہر سال سوا سوا سو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھن اٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے، کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سن لیں۔"

چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"اے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عیب ہے کہ صفائی کے نام پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا اتنی بی آج کل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی

ایسا تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں۔" یہ چوٹ بچاری صغرا پر ساس نے کی......

ہماری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں ساٹھ برس کی عمر ہونے پر بھی بہت شوقین تھیں اور باوجود بے شمار ساڑیاں ہوتے کے صبح ہی دو نئی ساڑیاں خریدی تھیں مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا میں نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساڑیاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں"؟

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آ رہا تھا۔ کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں۔ کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشین کی قیمت نو روپے گز زیادہ ہوگئی۔ ۲۷ روپیہ میں وہ ساڑی ملی۔ تو بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن سکتا ہے۔ اور دوسری تو وہ سودیشی سلک تھا۔ ۱۷ روپے میں سستی ہی مل گئی۔ میں کہتی ہوں کہ آج کل تو وہ برا زمانہ آ گیا ہے کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا۔ بڑی مصیبت کے دن ہیں...... اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے۔"

"آپ سچ کہتی ہیں اماں جان۔" بھابی عطیہ نے لمبی سانس لے کر دل دکھا دینے والی آواز میں کہا۔" یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام و چین اس کمبخت کی نذر ہوگیا ہے۔"

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا بھی ٹھیک ہے...... پٹرول کے دام ہیں کہ بادام کے مول اور پھر بھی ناپید، وہ تو کہو کہ تمھارے بھائی میاں کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی شکار کی موٹر بائیک تھی۔ اس جھگڑے کو بچاس روپیے دے کر رجسٹر کروایا تو کہیں جا کر دو موٹروں کا تیل چوتھیں گیلن نصیب ہوا۔ سچ پوچھ اس لڑائی میں تو پچھلی لڑائی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے۔" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

"ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سویرے سیر کرنے کی عادت

برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہوئی ہے ناس ہی ہو گئی" میری اماں نے صاد کیا۔

"ہاں یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پہ پابندی سرکار نے کیوں لگادی۔ اب دام دو روپے چار آنے گیلن تھے چلو تین روپے کر دیتی لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی۔ جس کے پاس دام ہوتے وہ خریدتا۔ جس کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا" بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا کہ جیسے گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پہ ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پر آفت آئی ہوئی ہے لو بھلا سیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی کھا جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور انڈے؟" چچی اماں نے کہا "بارہ آنے درجن تو ہو گئے اور مرغی وہ بھی اب دو روپے تک ہو گئی۔ کوئی کھائے تو کیا کھائے اور تو اور آج تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس کہیں ملے ہی نہیں۔ بلا سے پچھلے مہینے بیس روپے میں سات سیر کا ٹین مل تو گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ..... فروٹ سیلیڈ بغیر پرونس کے بچے تو چکتے بھی نہیں ....."

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے۔" عطیہ نے ساس کے ساتھ ہمدردی کی۔ "راشد تو برابر یہی کہتا آتا ہے کہ دادی اماں کا خانساماں بہت ہی اچھے چیز اسٹیکس بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں سے بھی اچھے ....."

"اے لو تو میں کیا کروں دولھن کو کنگ چیز تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میں اسلم کی دکان پر خود گئی اور کہا کہ بھئی سونے ہی کے مول ذرا سا دیدو۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے لیکن وہ کہیں ہو تو ملے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی" بھابی عطیہ نے سوسو

کرکے ایک دم سے کہا۔

"اے سچ تو ہے! اس کمبخت واجد نے نہ تو لکڑی پوری ڈالی اور نہ ہیٹر اب تک لگایا۔ ارجمند ذرا اس گھنٹی کا بٹن تو دبانا..... چار چار تو ہیٹر ہیں اور پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کرو۔ بوا آج کل تو کوئلہ بھی دو آنے سے دو روپیہ ہو گیا بجلی ہی سی رہتی ہے۔ اے لو وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

پھر صغرا سے کہا " ذرا صغرا تم جانا دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے تمھاری جٹھانی کو سردی لگ رہی ہے....." صغرا اون کو چھوڑ کر جلدی سے اٹھیں اور ساتھ ہی میں بھی۔ "بھابی ٹھیرو میں بھی آتی ہوں" کہہ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"دیکھو گرم کمرے میں..... جاتا ٹھنڈ میں نہ جاتا" اماں کی آواز میرے کان میں آتی ہی رہی کہ میں اور بھابی برآمدے میں ہو کر باہر آ گئے۔ باہر ہوا اتنی تیز اور ٹھنڈی تھی کہ جسم کے آر پار ہو رہی ہو بھابی نے باہر نکل کر واجد! واجد! کہہ کر آواز دی! اور کوئی جواب نہ پا کر بولیں "بیچارا سردی کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہوگا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھا گھنٹہ ہے" وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں۔ تھوڑی دور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ مالن مع اپنے تین چار بچوں کے بیٹھی تھی۔ دھوبن بھی مع اپنی فوج کے جمی ہوئی تھی۔ واجد اور دوسرے خدمت گار بھی وہاں موجود تھے۔ مہتر بھی ایک کونے میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی "اے چھوٹی دولھن ذرا ادھر آنا!"

چھوٹی دولھن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگیں سب مرد تو کھڑے ہو گئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغرا نے پوچھا۔

"اے دولھن! یہ لڑائی کب تک چلے گی؟"

"بہت دن..... کیوں؟"

"ہے رام!... سچی؟"

"ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی۔" صغرا نے لاپرواہی سے کہا۔

"تو ہم لوگ کیسے جئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے۔"

"تین سیر تو گیہوں ہے۔" ایک مزدور نوکر نے اطلاع دی۔

"اے بیٹا سچ بتاؤ۔ یہ بپتا کب ختم ہوگی؟ ہمرا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا" مالن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے۔"

"دلہن تم ہر بات میں مجلخ کرتی ہو۔ سچی بتاؤ اکھبار میں کیا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا۔

"ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔" سب نے امید بھری نظر میری طرف پھیری۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی۔

"دلہن! تمہیں تو ہوا کہت رہیں کہ نوکروں میں چھٹنی ہوگی؟ کا یہ ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" واجد ہیٹر لگانے چلا گیا۔ میں اور بھابی وہیں لاؤنج پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے۔ راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑے نہیں پہنے تھی ـــــ بولیں "ادی ارجمند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آجائیگی..." میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی بغیر سوچے سمجھے اور بیزور دیکر بولی "یہ اور کی آپ نے خوب کہی۔" بھابی ہنسیں۔ "اف! تب تو کیا بھابی عطیہ کی چار جٹ مہنگی ہوگئی یہ کم مصیبت ہے۔ تمہاری اماں کی ہوا خوری گئی یہ کچھ کم مصیبت ہے اور ہماری ساس بچاری کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں۔ نہ کوکنگ چیز ہی ملتا ہے اور نہ پروفس... اور اس پر اگر تمہیں نمونیا ہو گیا؟"

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت شرافت اور تہذیب کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

"...... اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساڑیوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُر مسرت گھر ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔"

"...... اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ ہمارے نونہالانِ قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ

ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا۔ انھیں بھی صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہو گا۔۔۔"

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانے میں مدرس رہ چکے تھے، اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے:۔

"صاحبان واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبا کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کی بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ

دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کے سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکش حیات سے تھک کر باقیماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے۔ تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے "صاحبان رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ۔ ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا ہا ہو ہو ہو، سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کر سکتا ہے....."

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے لہجے میں حد درجہ متانت تھی بولے: "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقے کا وجود

ہمارے شہر اور ہماری تہذیب و تمدن کے لیے باعث صد عار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے :"یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمایشی قہقہہ ہوا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے:" حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں سے گھسنے نہ دینگے اور مفلس اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہونگے۔ یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے:" بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا:" صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کے اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انھیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیے کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں۔ مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ چاروناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصے تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں

اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقے میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤوں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دلبستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انھیں اچھے وصول ہو گئے تھے۔ اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد

کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور جابک دست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔ مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے۔ اور اپنے ساتھ کام کرنے کو بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا۔ اور سارا دن آس پاس کے گاؤوں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی۔ دو ڈھائی سو راج، مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلا سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی

۱۶۵۳۷

کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خُرد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے خربوزے۔ شہد سے میٹھے خربوزے کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا۔ گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے آموجود ہوا اور اسی بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، منشی، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذاں دیتا پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آموجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آجاتا اور اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں

سے راستے سے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر اُدھر گشت کرتا نظر آجاتا۔

ان بیسواؤں کے مکان کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش و بیکار مباش کچھ کیا کرو کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی حسن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گردا گرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے بے تکے قہقہے لگاتے عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہُو کا عالم تھا اب ہر طرف گھما گھمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی۔ اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرایش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکید کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنویں پر آیا اور پانی

بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائینتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مستانہ نعرہ سنائی دیتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے یہ سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دوکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کے سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے بڑے میدان میں زمین کو

صاف کر شامیانے نصب کر دیے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو میں بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوے ہونگے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ پاندان، پیکدان، پیچوان اور گلاب پاش رکھ دیے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو اس بستی کی تھیں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوے پھاے کانوں میں رکھے ادھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساڑیوں میں ملبوس غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری قدآدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوے لاے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل

کانٹوں سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال کر ٹب بھر رکھے تھے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتوں کی وضع کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں ہنستیں کھلکھلاتیں، جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں اور تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آواز قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے

پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے منبر کے طاقوں پر سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی بعض ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیوار پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں سے چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی۔ ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقّے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اُٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دُھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک جیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آگیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پہ لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاوڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکان دار کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچا بند کوئی نان بائی مندی کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایے سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور بستی میں ایک دکان کرایے پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبے، شربت کی بوتلیں اور مربے، چٹنی اچار کی بوتلوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی۔ وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پہ چپکا کر آویزاں کر دیے پھر تو صبح ہی جیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آموجود ہوتے اور شربت صندل، بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور

نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں ان بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے دلربا وغیرہ ٹانگ دیے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں پڑھنے آنے لگے جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی بھی آمدنی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجے کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھتے ہوئے کرایے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رخ کیا

اور ان میواڈں کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کرکے ڈیرے ڈال دیے
اس کے ایکٹر ایکٹری کے فن سے نہایت نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے
بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھلتے
تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔
شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی
کڑی محنت مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے
تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں
اور الغوزے بجاتے راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ بکتے، شہر سے پیدل چل کر
تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حُسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ
ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولا ہلاتا، کبھی مُنہ پھُلاتا، کبھی
آنکھیں مٹکاتا عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور سے قہقہے لگاتے
اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے چنانچہ شہر کے بڑے
بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس
تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے
کے لالچ میں یا ان کی فرمایش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ مُنہ سے ہارن بجاتے اور جب
کوئی تانگا آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس
دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے
ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ اُن سے کم دام پر سواریاں
بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگتے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی

شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبا ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے جوق جوق اس پُراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوئی تھیں اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے جھٹ زمینیں خرید اُن بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایے پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں۔ اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی ...... تو خاصی ہو گئی تھی۔ مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاکخانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھے بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا۔ جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا! اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھئیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا۔ تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہو جانے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچے میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیا ڈالے "دل پسند، دل بہار مالش" کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی ایک دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا۔ جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے! اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت کرنے والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دوا خانے کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں ایک کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت ایک محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں اور جریبیں اور اونچ نیچ

دیکھنے والے آلے لے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر کوٹنے والا انجن چلنے لگا......

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پُرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے اور ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزنامے تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شایع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبّی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم سالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حُسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی یعنی بجائے "حُسن آباد" کے "حَسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا۔ کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی"۔

یوں تو سارا شہر بھرا پُرا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوب صورت

سب سے بارونق، اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی۔۔۔۔۔"

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

بیگانہ

(۱)

صورت اور حرکات و سکنات سے ہر شخص اس کو پاگل کہہ دیتا اور ہم لوگوں نے تو اس کو پاگل ہی سمجھ لیا تھا۔ ہم لوگوں کو یقین تھا کہ وہ بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہے ورنہ ایسے خرقہ پوشوں کا سکنڈ کلاس میں کہاں گزر؟ بال پریشان، حجامت بڑھی ہوئی، ناخن گندے، شاید مہینوں سے نہیں کٹے تھے، آنکھوں میں حلقے پڑے تھے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، گال بیٹھے ہوئے تھے، برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا، کرتے اور پاجامے کے سوا اس کے بدن پر کچھ نہ تھا۔ کرتے کی یہ حالت کہ کہیں سے آستین نکلی ہوئی کہیں سے دامن مسکا ہوا، پاجامہ بھی اس سے بہتر حالت میں نہ تھا۔ لیکن جس بات نے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ حیرت میں ڈال رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اس کو سردی کا احساس مطلق نہ تھا، حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا اور اندھیرا ہو چکا تھا سامان ہی اس کے پاس کیا تھا کہ ایک چھوٹی سی میلی کچیلی گٹھری جس میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہے الغرض کچھ عجیب دھج تھی اور عجیب تیور تھے۔

ہم لوگ بنارس سے لکھنؤ آ رہے تھے، پرتاب گڈھ کے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ہم لوگوں کے ٹکٹ کا معاینہ ہونے لگا۔ اس پیکر وحشت نے بھی ایک ٹکٹ گٹھری کے ایک کونے سے نکال کر پیش کر دیا اور سب کے سب اس کا منہ تکنے لگے گاڑی چلی اور ہم لوگ پھر گفتگو کے طوفان میں اپنے انوکھے ہم سفر کو بھول گئے۔ ہم انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور اس قدر بلند آواز سے کہ بغل والے خانہ کے مسافر بھی حرف

بحرف سن سکتے تھے لیکن ہمارے حواس باختہ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گرد و پیش کی دنیا سے بہت دور کسی دوسری دنیا میں کھویا ہوا ہے، وہ بظاہر نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن رہا تھا، کھڑکی سے باہر خلا میں اس کی نگاہیں محو تھیں اگر ہم لوگوں نے پہلے ہی سے اس کو ہوش و حواس سے عاری نہ سمجھ رکھا ہوتا تو یہ سمجھتے کہ یہ شخص کسی گہری سوچ میں ہے اور اس کو چونکا کر ہوشیار کرنا دشوار ہے۔

ہم تین آدمی تھے۔ تینوں ہم خیال، ہم سن، ہم نوالہ، ہم پیالہ اور پھر ہم پیشہ یعنی تینوں ایک ہی کالج میں پروفیسر تھے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں جب ایسے احباب یک جا ہوتے ہیں تو ساری دنیا ہیچ ہو جاتی ہے۔ کون سا ایسا مسئلہ تھا جس پر ہم لوگوں نے بحث نہیں کی اور جس کو حل نہیں کر ڈالا۔ سفر کا مونس سگریٹ ساتھ تھا اور فلسفہ، شاعری، معاشیات و سیاسیات، غرض کہ زندگی کے تمام مسئلے اپنی تیز و طرار زبان کے ماتحت تھے، سارے قضیے طے ہو گئے تو محبت اور زندگی پر مابعد الطبیعیاتی بحث چھڑ گئی، مجھ کو شیلے کی وہ مختصر نظم یاد آگئی جس میں اس نے محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے، میں نے کہا:۔

"زندگی کا راز الفت ہے، اگر الفت نہ ہوتی تو آج کائنات میں کوئی نظام نہ ہوتا اور سوا انتشار و پراگندگی کے کہیں کچھ نہ ہوتا، بڑے سے بڑا مادہ پرست بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔"

یوں تو محبت کائنات کے ذرے ذرے میں ہے لیکن آدمی کی سرشت محبت میں ہے۔ محبت آدمی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔

اس پر ہمارے مسافر نے پہلو بدلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سکون میں خلل پڑ گیا ہے اور اب وہ بے چین ہے۔ اس نے ایک بار ہماری طرف دیکھا

اور ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر کر کہا۔

"چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

ہماری حیرت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کچھ دیر تک ہم دم بخود اس کو دیکھتے رہ گئے۔ اس نے بغیر ہم کو مخاطب کیے ہوئے خود بخود انگریزی میں کہنا شروع کیا:۔

" زندگی اور محبت! اس میں شک نہیں کہ بڑے دل فریب نام ہیں مگر اس سے آگے ان کی حقیقت، زندگی ایک فریب، محبت ایک طلسم، موت، تاریکی، نفسانیت یہ ہے اس چیز کی اصلیت جس کا نام "نظام کائنات" رکھا گیا ہے۔"

ہمارے فرشتوں کو بھی گمان نہ تھا کہ "گدڑی میں ایسا لعل" نکلے گا، میں اپنی حیرت پر قابو پا گیا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے خود ہماری طرف متوجہ ہو کر معذرت کے ساتھ کہا:۔

میں نے بیجا مداخلت کی ہے، اگر آپ حضرات کو ناگوار ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے، اگر آپ لوگ محبت اور زندگی کی بے معنی بحث نہ چھیڑ دیتے تو شاید عمر بھر میرے ساتھ سفر کرتے رہ جاتے اور آپ کی بکواس کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا، میں جہاں اب تک تھا وہیں ہمیشہ رہتا، اب اگر مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہے جو آپ کے نزدیک غیر مہذب یا بے محل ہے تو اس کے ذمہ دار خود آپ ہیں، ہاں مجھے اعتماد ہے اور تجربہ و مشاہدہ نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ زندگی موت کا ایک کھیل ہے، محبت نفس کا ایک دھوکا ہے آپ لوگوں کو یہ توقع نہ تھی کہ میں اس قسم کا آدمی نکلوں گا، آپ مجھے کوئی دیوانہ یا کوئی جاہل گنوار تصور کر رہے تھے۔ خیر ممکن ہے میں وہی ہوں، جو آپ نے سمجھ رکھا تھا، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے بھی کبھی اپنا وقت ادبیات و فلسفہ میں گزارا ہے اور زندگی کے مسئلوں پر غور کیا ہے مگر اب تو میں ہوں اور ایک عالم گم گشتگی، کسی مسئلہ پر غور کرنا تو درکنار اب یہ بھی نہیں سوچتا کہ یہ اپنی کیا حالت ہو رہی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

زیادہ تر وہ انگریزی میں باتیں کر رہا تھا، زبان ایسی ستھری اور دل فریب کہ ہم تینوں کو اُس "غبارِ ناتواں" پر رشک آنے لگا۔ وہ اب خاموش تھا لیکن چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بے چین ہے اور کسی اندرونی شورش کو دبا ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے ہم لوگ انتظار کر رہے تھے کہ ابھی وہ کچھ کہے گا مگر وہ چپ رہا۔ مجبوراً میں نے اُس کی مہرِ سکوت کو توڑنے کی غرض سے کہا:۔

"کیا ہم لوگ آپ کا نام جان سکتے ہیں؟ اگر گراں نہ گزرے تو بتائیے کہ آپ کون ہیں اور آپ کی زندگی میں کیا ایسے ناموافق واقعات پیش آئے جن کی بنا پر آپ نے یہ کلیہ قایم کیا ہے؟"

اُس نے کہا: "بس اتنا بہت ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، میں واقعی آپ کی دلچسپ گفتگو میں خلل انداز ہوا۔"

"بالکل نہیں"۔ میرے ایک دوست نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم کو ایک ایسا شخص ہم سفر مل گیا جو ان مسایل پر اظہارِ خیال کر سکتا ہو اور اگر آپ اپنا تعارف ہم لوگوں سے کرا دیں تو پھر زہے نصیب۔"

"میں کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ ہوں تو بتاؤں بھی اور اگر کچھ ہوں بھی تو خود مجھے خبر نہیں کہ میں کیا ہوں، قصہ مختصر یہ کہ انسان ہوں، ہاں اسی آدم کی نسل سے جس کا خمیر آپ لوگوں کے کہنے کے مطابق عشق سے ہوا ہے۔ اس سے آگے مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا ہوں؟"

ہم سے کسی کو اب اور کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ تینوں اُس شاعرِ وحشی میں محو ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا:۔

آخر کچھ تو بتایئے کہ آپ کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جائیں گے؟"

اُس نے کہا: "میں صرف آپ کے آخری سوال کا جواب آسانی سے دے سکتا ہوں۔ اس وقت میں لکھنؤ اتروں گا۔"

"کہاں قیام ہوگا؟"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا: "دیکھیے کہاں قیام ہوتا ہے اب تک تو خبر نہیں کہ رات کہاں کٹے گی۔"

میں نے کہا: "تو کیا غریب خانہ کو سرفراز فرما سکتے ہیں؟ امید ہے کہ آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔"

اُس نے جواب دیا: "مجھے انکار نہیں لیکن آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی۔"

میں نے فوراً جواب دیا: "ہرگز نہیں ہماری سب سے بڑی مسرت یہ ہوگی کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

اس نے کہا: "خیر! مجھے کوئی عذر نہیں لیکن اتنا واضح رہے کہ رات بھر سے زیادہ میں آپ کا مہمان نہیں رہوں گا، صبح کو میں آزاد رہوں گا کہ جہاں چاہوں جاؤں اور جہاں چاہوں رہوں۔"

اس کے بعد اس نے بڑے اثر کے ساتھ یہ شعر پڑھا:۔

نہ ملا ہے نہ ملے گا مجھے آرام کہیں
عمر گزری ہے یوں ہی صبح کہیں شام کہیں

(۲)

یہ ایک رات کا مہمان ہم کو عمر بھر یاد رہے گا۔ بڑی دیر تک تو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے، آخر کار اس کے قیافہ اور

حرکات وسکنات کا غایر مطالعہ کرنے کے بعد ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے عقیدت مندانہ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے کیونکہ وہ پورا مجذوب تھا اور اگر ذرا بھی دنیاداری برتی جاتی تو ساری رات یونہی گزر جاتی اور وہ راہ پر کبھی نہ لگتا اور نہ کبھی اپنی سرگزشت سناتا۔

ہمیں یہ فکر تھی کہ وہ کسی طرح اپنا ماجرا سنائے۔ مگر وہ غیر متعلق باتوں سے ہم کو بہلاتا رہا۔ اس طرح کوئی رات کے دس بج گئے۔ کھانا آج معمول سے زیادہ دیر میں کھایا گیا۔ اُس نے برائے نام کھایا اور دسترخوان سے ہاتھ کھینچ لیا۔ معلوم ہوا اس کی یہی خوراک ہے۔

گیارہ بجے کے قریب اُس نے کہا "اگر زحمت نہ ہو تو ایک بار اور چائے پلائیے"

ہم لوگوں نے برقی چولھے پر اپنے ہاتھ سے چائے تیار کی۔ اُس نے کہا "آپ لوگ واقعی دردمند دل رکھنے والے ہیں، ورنہ آپ کو کیا پڑی ہے جو ایک خاک بسر شوریدہ حال دربدر کی ٹھوکر کھانے والے کے ساتھ ایسی ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کے خلوص کا دل سے قائل ہو گیا ہوں لیکن اس کا بدلا میں کیا دوں، میرے پاس کیا ہے اور میں کس لایق ہوں آپ میری زندگی کی داستان سننا چاہتے ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ ایک چپ میں ساری بلا ٹال دوں اور کسی کے سامنے اپنے کو رسوا نہ کروں۔ مگر اب میں اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ آپ کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے دیوانگی چھوڑ کر ہوش میں آجاؤں، مگر آخر آپ لوگ کیا سننا چاہتے ہیں؟ اور میں آپ کو کیا سناؤں؟

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

اگر یہ اجمال کافی نہیں ہے تو اور سنیے:-

ہماری منہ مانگی مراد مل گئی۔ من کی موج تھی وہ خود اپنا ماجرا سنانے کے لیے تیار ہو گیا تھا، اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی! سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اس نے کہنا شروع کیا :-

"یوں تو بچپن ہی سے کچھ میری اٹھان ایسی رہی اور ماحول ایسا تنگ و تاریک اور دم گھٹانے والا تھا کہ میں زندگی کو کردہ یا ناکردہ گناہوں کی سزا ماننے پر مجبور تھا آگے پیچھے جدھر نظر اٹھتی مصیبت و ابتلا کا دھاوا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ سکون راحت کسی کے مقدر کی چیز نہیں۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ غم ہے، ہر شخص کو کسی نہ کسی بات کا رونا، یہ تھا میرا روز کا مشاہدہ، پھر اگر میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جینا ایک قسم کا دردِ سر ہے تو کیا غلط تھا؟"

میں کم سنی میں یتیم ہو گیا تھا، میرے چچا جو کسی حد تک خوش حال تھے میرے مربی ہوئے اور انٹرنس تک مجھے پڑھایا۔ عربی، فارسی میں انھیں کے زیرِ دامن خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، میں ان کے احسانات کبھی نہ بھولوں گا، مگر انٹرنس کے بعد وہ بھی میرا بار برداشت نہ کر سکے اور پھر چھوڑ دیا گیا کہ جہاں چاہوں جاؤں اور اپنے فلاح کی جو صورت نکال سکوں نکالوں، اب میری مثال اس سفینے کی تھی جس کو کشتی بان کسی طوفانی سمندر میں چھوڑ کر چلا جائے۔ میں فطرتاً شاعر تھا، اردو، فارسی کے مشہور شعرا کے کلام میری زبان پر تھے، چودہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگا تھا۔ مذاق اچھا تھا، مطالعہ وسیع تھا اس لیے اچھا کہتا تھا، تخلص بیگانہ تھا اور آج تک میرے اکثر جاننے والے مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔ شعر و سخن میں میں نے تھوڑا بہت نام بھی پیدا کیا۔ جی ہاں! آپ کا خیال صحیح ہے، کبھی کبھار میرے خرافات رسائل اور اخبار میں چھپتے رہے ہیں، میں شروع سے شعر اچھا کہتا تھا، اس وقت میری عمر بتیس سال کی ہے، اب سے کوئی پندرہ سال پہلے کے اشعار سنیئے :-

وہ اور عدو سے وفا کرینگے، دغا کرینگے دغا کرینگے
یہ ہم سے پوچھو کہ زندگی بھر خراب عہدِ وفا رہے ہیں

یا یہ شعر سنیئے :۔

رقیب بہرِ عنایت، رقیب بہرِ کرم
گناہگار یہی خانماں خراب اُن کا

اس سے غالباً دو تین سال بعد کا یہ شعر ہے :۔

ہُو ہے لب پر تو کلیجے سے لگی ہے تصویر
کفر آیا ترے وحشی کو نہ اسلام آیا

مَیں بھی اپنی وحشت کی رو میں موضوع سے کتنی دور ہٹ گیا۔ کہنے لگا یہ مقصد تھا کہ میں شاعر تھا اور شاعر کے خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ نہ ہمیشہ ملول و غمگین رہ سکتا ہے، نہ ہمیشہ شگفتہ و بشاش۔ کبھی اگر زندگی کی صعوبتوں سے عاجز آکر وہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ :۔

"ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے"

تو کبھی کبھی مدہوش ہو کر یہ نعرہ بھی لگانے لگتا ہے۔

مبارک مجھ کو بھی کیفِ آشنائے سوز ہو جانا
مبارک اِنتہائے دل کو دل افروز ہو جانا

یہ میری نظم کا ایک شعر ہے جس کا عنوان "شاعر کا پیغام" تھا دیکھیے پھر میں بہک چلا۔ قصہ مختصر جوانی کی عمر تھی۔ رگوں میں اُپج تھی، دل میں حوصلہ تھا، گھر چھوڑا تو سیدھا علی گڈھ پہنچا، یتیموں اور لاوارثوں میں میرا شمار کیا گیا اور میں نے صرف اپنی اپج کی بدولت اور اپنے بل بوتے پر وہاں سے بی۔ اے پاس کیا۔ جب تک وہاں تعلیم پاتا رہا استادوں اور ہم چشموں میں ممتاز رہا۔ وسعتِ مطالعہ و دقتِ نظر

کی بدولت میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، انگریزی اردو دونوں میں میری طرزِ انشا قابلِ تقلید سمجھی جاتی تھی۔ میں اپنے ذاتی رسوخ کی بدولت اگر چاہتا تو کسی بڑے سرکاری عہدے پر مامور ہو جاتا مگر میرے اندر آزادی اور خودداری کا جذبہ ضرورت سے زیادہ تھا، میں کسی کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسی زمانے میں لکھنو کے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے (خدا اُن کا بھلا کرے) مجھے ترغیب دی کہ میں لکھنو آؤں اور اس اخبار کی ادارت میں اُن کی مدد کروں، میں معاون مدیر بنایا گیا۔ اس سے زیادہ وقار اور اعزاز میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا؟ اب یہاں سے میری زندگی نے بُری طرح پلٹا کھایا۔

چائے کا دور چل رہا تھا۔ بیگانہ پیالی پر پیالی خالی کر رہا تھا اور اُس کا جی بھرتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس نے ایک پیالی اور مانگی اور سلسلہ شروع کیا:۔

اب تک عورت اور محبت کا مجھے کوئی ذاتی تجربہ نہیں تھا، میں بڑی سلامت روی کی چال چل رہا تھا، قدم قدم پھونک پھونک کر رکھتا تھا کہ کہیں کسی تازہ فتنہ میں نہ پڑ جاؤں اور پھر کہیں کا نہ رہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ان مصروفیتوں اور دلبستگیوں سے بالکل ناآشنا رہا۔ میرے اکثر ہمجولی اپنے اوقات ضائع کرتے رہتے تھے لیکن شاعری مجھے بتا چکی تھی کہ محبت کیا ہے اور میں محبت کو ایک اچھی چیز سمجھتا تھا۔ ہاں یقین جانیے میں بھی آپ لوگوں کی طرح محبت کو ایک کیمیا سمجھتا تھا جس کا حاصل کرنا انسان کی زندگی کا اصلی مقصد ہے اور جو زندگی کی حیثیت اور ماہیت دونوں کو بدل دیتا ہے، یہ سچ ہے کہ میں زندگی کو کسی دیو کی غارت گری سمجھتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس راکشش اور اُس کی غارت گریوں سے اگر پناہ مل سکتی ہے تو محبت کے ہاتھوں۔ حاتم کا یہ شعر میں اکثر پڑھا کرتا تھا:۔

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

میرا عقیدہ تھا کہ یہ سارا "دردِ سر" "پیا" کے نہ ملنے تک ہے "پیا" مل جائے تو "دردِ سر" بھی کیف و سرور ہو جائے، میں محبت کو "ھُوَ الْاَوَّلُ ھُوَ الْاٰخِرُ" سمجھے ہوا تھا، دونوں جہاں "مَتَاعُ الْغُرُوْر" ہوں تو ہوں مگر محبت ایک مقدس حقیقت ہے جو زندگی کو بھی ایک حقیقت بنائے ہوئے ہے یہ تھا میرا فلسفہ۔

میں لکھنؤ میں بڑی فراغت اور شادمانی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو مہینے جیب میں آتے تھے کسی دوسرے کا بار اپنے سر نہ تھا اکیلے دم کے لیے ماہانہ رقم ایک خاصی دولت تھی۔ میں اپنی قلمرو کا گویا مطلق العنان بادشاہ تھا، کچھ احباب تھے جن کی صحبت میں دنیا اور دنیا کے آلام کو بھولا ہوا تھا آخر کار وہ گھڑی آئی جس نے مجھے ایک فردوس مستقبل کا خواب دکھا کر دیکھتے دیکھتے مجھے ہوشیار کر دیا اور میری زندگی کو سرتا سر دوزخ بنا دیا۔

میں روز شام کو بنارسی باغ کو سیر کو جاتا تھا، ایک دن حسب معمول گھومتا پھرتا اس مقام پر پہنچا جو رنگ برنگ کی چڑیوں کے لیے وقف ہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں جمع تھے، میں ایک سرخ ساٹن کے رنگ کے توتے کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ اگلے زمانے کے قصوں میں جس ہیرامن توتے کی اتنی شہرت ہے وہ یہی توتا رہا ہوگا۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا؟ چند منٹ اس عالم میں گزرے ہونگے کہ میری نظر ایک نوجوان لڑکی پر پڑی جو مجھ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی اسی خوش رنگ خوش ادا پرندے کو دیکھ رہی تھی اور اپنی نگاہوں سے اس کی رعنائیوں اور دل ربائیوں کی داد دے رہی تھی حسن کی داد حسن ہی دے سکتا ہے۔ میں اب توتے کو چھوڑ کر اس "پیکر رنگین" میں محو

ہو گیا جس کا اپنی ہم جنسوں میں قطعاً وہی مرتبہ تھا جو اس توتے کا اتنے پرندوں میں تھا، آپ لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیسی تھی؟ کیا بتاؤں کیسی تھی۔ سراپا کھینچنے کی قابلیت مجھ میں نہیں اور نہ ایسوں کا سراپا کھینچ سکتا ہے اس کے دیکھنے کے بعد میں نے سمجھا کہ خسرو کا تخیل مجبور کیسے ہو گیا اور آخر میں انھوں نے یہ کہہ کر کیوں ختم کر دیا "وز ہر چہ گویم برتری حقا عجائب دلبری" بس "بہار بسر و نو روز آغوش" سمجھیے شاعروں نے معشوق کے رنگ روپ اور سج دھج کی جتنی تعریفیں کی ہیں یقین مانیے کہ وہ ان سب سے بالاتر تھی، میری مبہوت نگاہوں نے شاید غیر شعوری طور پر اس کی رگوں میں کچھ گدگدی پیدا کی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا اور میری صورت اور انداز میں نہ جانے کیا پایا کہ آنکھیں شرما کر جھکا لیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت وہ کیا معلوم ہوتی تھی۔ جس وقت میں بنارسی باغ سے لوٹا ہوں تو میری زبان پر یہ مصرعہ تھا:۔

"آج اس طرح دیکھا ہے پریزاد کہ بس"

اُس دن سے میں اپنے دل میں ایک نئی خلش محسوس کرنے لگا اور یہ وہی خلش معلوم ہوتی تھی جس کو شاعروں نے محبت بتایا تھا۔ اس میں ایک تازگی، ایک ندرت، ایک کیفیت، ایک ٹھنڈی جلن تھی، میں روز بنارسی باغ جاتا تھا اور روز یہ اندر سبھا کی پری مجھے ملتی تھی، مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا یہ دراصل کسی چھتری کی لڑکی تھی۔ مگر بچپن سے لاوارث تھی، کوئی اس کو اپنی پناہ میں لینے والا نہ تھا مسیحیت کے مبلغ آپ جانتے ہیں ایسے وقت میں کس مستعدی اور تپاک سے آگے بڑھتے ہیں اور کام آنے پر تیار ہو جاتے ہیں، یہ بے کس لڑکی بھی اُن کے حلقے میں آگئی اور اب اُس کی زندگی خوش گوار اور پُرسکون تھی، جس وقت میں نے اُس کو دیکھا تھا وہ لڑکیوں کے کالج میں ایف۔ اے میں پڑھتی تھی، اس نے اپنا

ہندوانہ نام قائم رکھا تھا اور مس مہروترا کہلاتی تھی۔ جو لوگ اس سے بے تکلف تھے اس کو کرشن کماری کہہ کر پکارتے تھے، یہ اس کا اصلی نام تھا۔ عام طور پر وہ مغرور سمجھی جاتی تھی اس لیے کہ وہ کسی سے ملتی جلتی نہ تھی۔

میرے دل کی خلش کچھ اس طرح بڑھی کہ ایک درد بن کر مجھ پر چھا گئی میں روز اسی طرح بنارسی باغ جاتا تھا اور چپ چاپ اس "نور کی پتلی" کو دیکھ کر چلا آتا تھا۔ کئی بار چاہا کہ اس سے کچھ باتیں کروں اور اُس کو باتوں باتوں میں اپنی "ارنی" بھی سنا دوں، مگر میری گویائی نے ساتھ نہیں دیا اور میں گونگوں کی طرح اس کو پوجتا رہا، دو مہینے یوں ہی گزر گئے۔ میں برابر بنارسی باغ جاتا رہا وہ البتہ کئی بار ناغہ کر چکی تھی، اب تک صرف دو ایک بار اُس نے جانوروں کے متعلق اِدھر اُدھر کی باتیں مجھ سے کی تھیں اور بس۔

ایک دن اُس نے ہنس کر مجھ سے کہا "آپ مجھ سے زیادہ معمول کے پابند معلوم ہوتے ہیں کسی دن آپ نے بھی اپنی سیر ناغہ کی ہے؟"

اُس وقت ایک ایک کر کے بھیڑ چھٹ چکی تھی سوا میرے اور اُس کے اور کوئی نہ تھا۔ مگر اُس دن بھی میری زبان بند سی ہو گئی۔ میں اس سے زیادہ جواب نہ دے سکا کہ "جس دن سے آپ کہہ رہی ہیں اُس دن سے آج تک تو شاید کسی دن ناغہ نہیں ہوا ہے۔ اس سے پہلے یاد نہیں۔"

میں سمجھا کہ کچھ نہ کہہ سکا لیکن شاید میری صورت اور لہجے نے بہت کچھ کہہ دیا تھا، اُس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اس کے چہرے پر حیا اور معصومیت کا گہرا رنگ دوڑ گیا۔

دوسرے دن میں مصمم ارادہ کر کے چلا کہ اپنی تمنا کا اظہار ضرور کروں گا اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ میں پہنچا۔ کرشن کماری وہاں پہلے سے موجود تھی۔ دیر تک ہم

ادھر اُدھر کی سیر کرتے رہے۔ جب لوگ اپنے اپنے گھر جانے لگے اور وہ بھی رخصت ہونے لگی تو میں نے ذرا ہمت کر کے کہا:۔

"ہم اتنے دنوں سے ایک دوسرے سے اتنا قریب ہو کر دیکھ رہے ہیں اور ہمارے درمیان اب تک شناسائی نہیں ہوئی مجھے تو خیر معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کون ہیں اور کیا کرتی ہیں، مگر کیا آپ یہ جاننا نہیں چاہتیں میں کیا ہوں اور کس قسم کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تھوڑی دیر یہاں اور رک جایئے میں کئی دن سے آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا، جس کا کہہ دینا کم از کم میرے لیے ضروری ہے مگر اب تک نہ مجھے اس کا موقع ملا اور نہ میری ہمت پڑی کہ کہوں۔"

وہ ہچکچائی اور رک کر کہا۔ "نہیں کوئی حرج نہیں، میں رک سکتی ہوں، میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ آپ سے پورا تعارف حاصل کروں مگر کل سے پہلے اس کو بے محل اور خلاف آداب سمجھتی تھی۔ آج گھر سے سوچ کر چلی تھی کہ پوچھوں گی آپ کون ہیں اور لکھنؤ میں کیا کرتے ہیں؟ مگر خدا جانے کیوں بھول گئی۔"

اس کے بعد پھر چہرے کی سرخی بڑھ چلی تھی اس نے مجھے اس پر غور کرنے کا موقع نہیں دیا اور کہنے لگی:۔

"مگر اب بتلایئے کہ آپ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں اور اسی سلسلے میں وہ بھی کہہ ڈالیے جو آپ اتنے دنوں سے کہنا چاہتے ہیں۔"

اس نے پھر نظر نیچی کر لی، وہ بری طرح شرمائی جا رہی تھی۔ شاید اُس نے میرے لب و لہجے سے پتہ لگا لیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔

میں نے اپنا نام بتایا اور کہا "میں ایک انگریزی اخبار کا معاون مدیر ہوں، شروع سے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا، اکثر انگریزی اور اردو اخبار و رسائل میں مضامین لکھا کرتا ہوں، اردو میں شعر بھی کہا کرتا ہوں ......" میں خواہ مخواہ اپنے تعارف میں اتنی

طوالت سے کام لے رہا تھا۔ کیونکہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اصل مطلب پر کیسے آؤں۔

اس نے اسی طرح نظر جھکائے ہوئے جواب دیا ”تو میں آپ کا نام سن چکی ہوں اس اخبار کا ایڈیٹر لکھنؤ میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور یوں بھی آپ بات چیت، حرکات و سکنات سے ادیب و شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی گفتگو میں ایک انداز ہوتا ہے مگر خیر! آپ اپنی بات کہیے“

میں نے اُس کو بغور دیکھا اور پھر کہا ”میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے متعلق آپ کو کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ اگر آپ وعدہ فرمائیں کہ جو کچھ میں کہوں اُس کو غور سے سنیں گی اور ناگوار خاطر ہوا تو مجھ کو معاف کر دینگی تو کہنے کی جرات کروں“

”ہاں میں نے وعدہ کیا کہیے اور جلد کہیے“ اس نے جواب دیا۔

”آپ اپنے خدا کو مان کر مجھے اوباش نہ سمجھیے گا۔ آج اگر آپ نے وہ جذبہ میرے اندر نہ پیدا کر دیا ہوتا جس نے مجھے اس طرح مجبور و بے بس کر رکھا ہے تو شاید نوبت نہ آتی، مگر اب تو یہ نوبت آگئی“

اتنا کہہ کر میں رک گیا اور پھر یہ مصرعہ پڑھا۔

”اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را“

اس نے کہا ”اس کا مطلب سمجھائیے“

میں نے اپنا مطلب سمجھایا۔ اُس نے اپنا مسکراتا ہوا معصوم چہرہ اوپر اٹھایا اور مجھے دیکھنے لگی۔ انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میری زبان سے محبت کا اقرار سن کر مجھ زیادہ حیرت نہ تھی۔ میں نے پھر کہا۔

”اگر میں نے گستاخی کی ہے اور اگر آپ اس سے بدمزہ ہوئی ہیں تو خدا کے لیے معاف کر دیجیے میں پھر کبھی نہ کہوں گا، میں آپ سے بھاگتا رہوں گا اور اپنی صورت آپ کو کبھی نہ دکھاؤں گا، لیکن اتنا یقین رکھیے کہ آپ نے مجھے بیتاب

کر دیا، ورنہ میں اپنا راز اس طرح افشا کر کے اپنے کو رسوا نہ کرتا، آپ کو دیکھنے کے بعد میری جو حالت ہو گئی ہے وہ میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ کیٹس کا کہنا غلط نہیں "حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے"۔ اب میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "اگر دل کو راحت پہنچانا ہو تو کسی حسین چیز سے لگائیے" یہ آپ نے مجھے بتایا، مجھے یہ کہنے میں مطلق عار نہیں کہ سوتے جاگتے آپ مجھ پر چھائی رہتی ہیں، آپ ہی کا خواب دیکھا کرتا ہوں، آپ ہی کے تصور میں کھویا رہتا ہوں اب آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہہ دیجیے لیکن اگر آپ نے مجھے لکھنو کے تماش بینوں میں شمار کیا تو اس سے بڑھ کر ظلم اور حق تلفی نہیں ہو سکتی۔"

اُس نے کہا "آپ اطمینان رکھیے میں آپ کو وہی سمجھتی ہوں جو اب سے پہلے سمجھ چکی ہوں، مگر آپ کی باتوں کا جواب اسوقت نہیں دے سکتی آپ مجھے اپنا پتا دے دیجیے۔ میں آپ سے خود آکر ملوں گی اس وقت مفصل گفتگو کروں گی"۔

میں نے اپنا پتا بتایا۔ اس نے کہا "اتوار کی صبح کو آپ میرا انتظار کیجیے گا"۔

میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ دفعتاً کسی نے مجھے فردوس بریں میں پہنچا دیا ہے۔ چند لمحوں نے میری دنیا کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔ کرشن کماری نے چند مبہم اور غیر واضح جملے کہہ کر میرے اندر ایک روح پھونک دی تھی۔ میں اب زندگی میں ایک نیا مزہ، ایک نیا نشاط محسوس کرنے لگا تھا۔

اتوار کے دن کے لیے میں گھڑیاں گننے لگا تھا، میں بے چین تھا۔ مگر یہ امیدوں کی بے چینی تھی اور اس میں ایک لذت تھی۔ خدا خدا کر کے اتوار کی صبح آئی اور اپنے ساتھ نوید مسرت لائی۔ کرشن کماری نے آتے ہی کہا "کہیے اب آپ کو کیا کہنا ہے"؟

میں نے جواب دیا "مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ پرسوں کہہ چکا اب اس وقت تک میں پھر اپنے میں کچھ کہنے کی تاب نہیں پاتا جب تک کہ آپ کچھ کہہ نہ لیں"۔

کرشن کماری مسکرائی، اس وقت اُس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی اور کہنے لگی "خود آپ کو روز روز دیکھتے دیکھتے آپ میں ایک کشش محسوس کرنے لگی ہوں مگر یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ میں آپ پر اسی طرح فریفتہ ہوں جس طرح آپ مجھ پر ہیں۔ آپ لوگ اتنا جلد چھلک پڑتے ہیں؟ محبت کے اظہار میں اس قدر عجلت نہیں کرنا چاہیے، آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ محبت کیا چیز ہے؟ اس کی غایت کیا ہے؟ اور اس کے مطالبات کیا ہیں؟ اور اگر غور کیا ہے تو کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟"

اس سیدھی سادی بھولی بھالی لڑکی سے ایسے سوچے سمجھے سوالات کی میرے فرشتوں کو بھی امید نہ تھی۔ میں دنگ رہ گیا لیکن پھر میں نے سمجھا کہ یہ اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ میں نے بے تامل جواب دیا۔

"یقین مانیے میں عمر بھر انھیں سوالات پر غور کرتا رہا ہوں میرا ایمان یہ ہے کہ اگر محبت نہ ہو تو زندگی ایک آزار ہے۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے اپنی حالت پر دن رات غور کرتا رہا ہوں اور میں اعتماد اور صداقت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے ایسی محبت کہ اگر آپ نے میری محبت کی پذیرائی نہیں کی تو میں خراب و برباد ہو جاؤں گا۔"

"اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عمر بھر آپ کی یہی حالت رہے گی؟" اُس نے سوال کیا۔ میں نے کہا "اگر میرے بس میں ہوتا تو دل چیر کر دکھا دیتا۔ کیوں کیا میری باتوں کا اعتبار نہیں آتا؟"

"نہیں یہ بات نہیں" اس نے جلدی سے کہا "مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ نے اپنے دل کو کہاں تک ٹٹولا ہے اور اپنی حالت کا کس حد تک صحیح اندازہ کیا ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو آپ کے لیے یہ بلند آہنگی اور اعتماد کے ساتھ

کوئی دعوےٰ نہ کرتی۔ زمانہ نہ جانے کیسی کیسی کروٹیں لیتا ہے' زندگی میں نہ جانے کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں' انسان زمانہ اور فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔"

"ہاں مگر محبت مجبور نہیں ہے" وہ زمانہ اور فطرت دونوں کی گرفت سے آزاد ہے" میں نے جوش میں آکر کہا۔

"ممکن ہے آپ ہی سچ کہتے ہوں" اس نے جواب دیا" خیر آپ کہتے ہیں اور میں مانے لیتی ہوں کہ آپ مجھے چاہتے ہیں اور آپ کے دل وزبان میں کوئی ناموافقت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ کی محبت کو نہ قبول کروں لیکن اس وقت اپنے اندر کوئی جذبہ نہیں پاتی جس سے میں مغلوب ہوں' ہاں آپ کے ساتھ ایک دلچسپی ضرور پیدا ہو گئی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر میں آپ کو اسی دھن اور سرگرمی کے ساتھ چاہنے لگوں۔ بشرطیکہ آپ کا دعوے صحیح ہو اور مجھے آپ یونہی چاہتے رہے' مجھے اب تک کسی مرد سے لگاؤ نہیں ہوا ہے آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرے دل میں جگہ پائی ہے۔"

میں یہ سن کر اچھل پڑا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر پوچھا "سچ؟ تو یہ میری محبت کی صداقت کا اثر ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ تھوڑی دیر کے بعد ہٹا لیے اور کہا" آپ نے میرے دل میں اتنی جگہ لے لی ہے کہ دن میں دو ایک بار آپ کا خیال ضرور آجاتا ہے۔ مگر دیکھیے یہ محبت کتنے دن رہتی ہے۔"

میں نے پوچھا" آخر اس بیگانگی کی وجہ؟ کیا اس سے پہلے بھی محبت کا کوئی تجربہ ہو چکا ہے"؟

اس نے کسی قدر برا مان کر کہا" میں نے ابھی آپ سے کہا ہے کہ آپ پہلے

شخص ہیں جس سے مجھ کو اتنا بھی تعلق پیدا ہوا ہے۔" میں شرمندہ ہو گیا۔

وہ اُٹھ کر جانے لگی تو میں نے کہا "میں یہ التجا کر سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملتی رہیں، اس سے مجھے بڑی راحت ملے گی اور میں آپ کو دعائیں دوں گا۔"

اس نے کہا "ہاں! میں اپنی فرصت کا زیادہ حصہ آپ کے پاس گزاروں گی مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔"

اب میری زندگی میں کمی کیا تھی؟ میں کرشن کماری کو اپنی چیز سمجھنے لگا تھا مذہبی اور معاشرتی اختلاف میرے لیے کوئی اختلاف نہ تھا مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ میری بیوی ہوگی اور میری اپنی مختصر دنیا سارے فتنہ و فساد سے الگ جنت کا ایک نمونہ ہوگی۔ کرشن کماری روز مجھ سے مل کر پیاری پیاری باتیں کر جاتی تھی اور میری محبت دن دونی رات چوگنی ہو رہی ہے۔

بیگانہ دم لینے کے لیے رک گیا اور ایک پیالی چائے اور پی کر کہنے لگا "چھ مہینے گزر گئے، یہ میری زندگی کی بہترین ساعتیں تھیں، آہ! کیسا خوب صورت خواب تھا، کتنا دل کش طلسم تھا، صبح و شام دونوں وقت کرشن کماری مجھ سے ملنے آتی تھی۔ اُس کی ایک ایک ادا، اُس کی ایک ایک حرکت گواہ تھی کہ وہ بھی مجھے بری طرح چاہنے لگی ہے۔ اب نہ اس کو مجھ سے کوئی حجاب باقی رہ گیا تھا نہ مجھ کو اس سے، اور بظاہر دونوں کی وہی حالت تھی جو سرشاران محبت کی ہونی چاہیے لیکن جب کبھی میں اُس کی زبان سے محبت کا اقرار لینا چاہتا تو وہ کچھ مضمحل سی ہو جاتی اور کہتی "بس جس طرح گزر رہی ہے گزرنے دو۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تم سے میرے دل کو گہرا تعلق ہو گیا ہے؟ کیا تم کو اس سے اطمینان نہیں ہے؟ آخر دنیا تک کے دھندے لے کر کیا کرو گے؟"

بعض اوقات وہ ایک عجیب عورت معلوم ہوتی تھی، جس کے دل کا بھید پانا مشکل تھا، کبھی کبھی مجھے الجھن سی ہونے لگتی تھی مگر میں اس کی محبت میں اندھا تھا اور کرشن کماری کی اس قسم کی پُراسرار باتوں کو بھی اس کا ایک شیوۂ دلبری سمجھ کر رہ جاتا تھا۔ میں اب کرشن کماری سے شادی کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا اور وہ مجھے تڑپا رہی تھی، میں جب کبھی یہ ذکر چھیڑتا تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی۔

"آخر میں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ہوں، اگر چاہو گے تو یہ بھی ہو جائے گا آخر جلدی کا ہے کی ہے"؟

آخر انتظار کرتے کرتے میں عاجز آگیا تو ایک دن اُس سے کہا۔ کرشن کماری آخر کب تک ٹالتی رہو گی؟ میں یہ جاننے پر تلا ہوا ہوں کہ تم زندگی بھر کے لیے میری رفیق بنو گی کہ نہیں؟ میں اب کوئی عذر نہیں سنوں گا۔ تم کو جواب دینا ہو گا لیکن یہ یاد رہے کہ اگر تم نے میرا دل توڑا اور انکار کیا تو پھر میرا خدا حافظ ہے"۔

کرشن کماری ابھی بلبل کی طرح چہک رہی تھی، یہ سن کر افسردہ ہو گئی اور اس کے بعد پھر میں نے اس کو دل سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، اس نے غیر معمولی سنجیدگی اختیار کر لی اور جواب دیا۔

"نہ کل تم دفتر جاؤ، نہ میں کالج جاؤں۔ دن بھر میں یہاں تمہارے ساتھ رہوں گی اور کل ہی کسی وقت تمہارے سوال کا جواب بھی دوں گی"۔

"کیا مجھے انکار کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے"؟ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"نہیں! اگر تم کو انکار نہیں تو مجھ کو بھی انکار نہیں۔ آخری فیصلہ تم پر منحصر ہے"۔ اس نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر میرا فیصلہ تم جانتی ہو۔ بس سمجھوں کہ بات طے ہو گئی"؟ میں نے جامے سے باہر ہو کر کہا۔

"ہاں..... مگر کل تک اور ٹھیرو۔" اس نے رک رک کر کہا۔

کرشن کماری چلی گئی تو میں سوچ میں پڑ گیا، رات کو دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، اس مسلسل حیلہ جوئی کے کیا معنی؟ یہ گول گول باتیں کس لیے؟ کیا وہ مجھ کو چاہتی نہیں نہیں! محبت تو اس کی ہر ہر نگاہ سے ٹپک رہی تھی پھر؟ کیا اس کی زندگی میں راز ہے؟ میں بالکل تاریکی میں تھا۔ سوچتے سوچتے سر دکھنے لگا آخر کار یہ کہہ کر سو رہا "کل تو فیصلہ ہو ہی جائے گا۔ یہ خواہ مخواہ کی بے چینی کیوں ہے"؟

جس "کل" کا وعدہ تھا وہ بھی آیا۔ آہ! کاش وہ "کل" میری زندگی میں کبھی نہ آتا۔ کرشن کماری کے آنے سے پہلے میں حضرت گنج گیا اور اس کے لیے ایک پچھتر روپے کی انگوٹھی خرید لایا۔ یہ خیال میرے دل میں ایک ولولہ پیدا کر رہا تھا کہ کرشن کماری اس تحفے سے کتنا خوش ہوگی، اگرچہ اس کے ساتھ کفایت شعاری پر ایک لکچر بھی دے گی۔ وہ کئی بار مجھے بے جا صرف پر جھڑکیاں دے چکی تھی۔

کرشن کماری آئی، دن بھر راز و نیاز ہوتے رہے، آج وہ کسی سوچ میں تھی اُس کا چہرہ دھندلا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری رات جاگتی رہی ہے۔ کبھی میرے پیار پر اگر میری خاطر سے مسکراتی بھی تھی تو اس کی مسکراہٹ میں تکلف نمایاں ہوتا تھا، کوئی بارہ بجے کے قریب اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیوں تم مجھے حسین سمجھتے ہو اور حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے"؟

میں نے کہا "بے شک"۔

"فرض کرو کہ میں ابھی لولی، لنگڑی، اندھی یا کوڑھن ہو جاؤں، کیا تب بھی تم مجھے چاہتے رہو گے"؟

میں نے ہنس کر جواب دیا "ہاں! مگر تم یہ ہذیانات کیوں بک رہی ہو"؟

"اچھا تو آج میں تم کو اپنے حُسن کا بہترین سماں دکھاتی ہوں جس کے اب تم مستحق ہو گئے۔"

یہ کہہ کر اُس نے سینے کے بند کھول دیے اور گردن سے ناف تک ننگی ہو گئی میں اپنی حالت کس زبان سے بیان کروں، اس لمحہ اور اس منظر کا خواب میں بھی گمان نہ ہو سکتا تھا اُف! یہ میں کیا دیکھ رہا تھا؟ کیا میری آنکھیں دھوکا دے رہی تھی؟ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، مجھے بجلی مار گئی تھی، میری زبان سے ایک حرف نہ نکل سکا مجھے سکتہ میں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں نشتر تھے۔ اس نے کہا:۔

"اب جلد فیصلہ کرو، میرے ساتھ شادی کب کرو گے؟"

میرا خون برف کی طرح جم گیا تھا، میرے مُنہ سے آواز تک نہیں نکلی، میری یہ حالت دیکھ کر اُس نے کہا:۔

"میں تم سے کہتی تھی کہ آیندہ کے متعلق کوئی دعوے نہ کرو۔ مگر تم تو میری صورت دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھے، پھر میں نے چاہا کہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں ہی خوش باشی کی زندگی بسر کر ڈالیں مگر تم نے یہاں بھی دم نہ لینے دیا۔ مجھے خود بھی تم سے دلبستگی پیدا ہو گئی تھی لیکن میں تمھاری محبت کی حقیقت جانتی تھی، اب تک تم کو اس راز سے کیوں آگاہ نہیں کیا؟ اس لیے کہ میں چاہتی تھی ذرا تمھاری محبت مستحکم اور راسخ ہو لے تو اس کو آزماؤں اور تمھیں بتاؤں کہ میرے حسن کی کائنات کیا ہے اور تمھاری محبت کی دراصل کیا حقیقت ہے۔ یہ داغ میرا موروثی ترکہ ہے۔ ہر پشت میں کوئی نہ کوئی اس میں مبتلا رہتا ہے، باپ دادا کے گناہوں کا پھل اب مجھے ملا۔ میں جانتی تھی کہ میں کسی کی محبت کے قابل نہیں ہوں گی مگر تم نے مجھے چاہا اور مجھے بھی بہکایا۔ اب تم سمجھے کہ میں تمھارا منہ کیوں نہیں چومتی تھی اور اپنا مُنہ تم کو

کیوں نہیں چومنے دیتی تھی میں سُن چکی تھی کہ یہ مرض ہونٹوں کی چھوت سے بھی اکثر پیدا ہو جاتا ہے ...... مگر اب تو تم یہ بتاؤ کہ مجھے زندگی بھر کے لیے اپنی رفیق کب بناؤ گے"؟

میں اسی طرح پتھر کی مورت بنا رہا، آخرکار وہ یہ کہتی ہوئی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی:۔

"اچھا تو خدا حافظ! میرا تمھارا ساتھ یہیں تک تھا، حسین چیز کی حقیقت اب تمھیں معلوم ہو گئی ہو گی۔ محبت کا راز اب کھل گیا ہو گا؟ اگر اُس وقت میں کہتی کہ محبت ایک دھوکا ہے تو تم کب ماننے والے تھے اور اب"؟

یہ کہتی ہوئی وہ زینے سے اتر گئی۔ میں نے اُس کو روکا بھی نہیں، جو انگوٹھی میں اس کے لیے لایا تھا اُس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی مگر ابھی اس کو پہنا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح مخمل کے ڈبے میں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی۔ میرے مُنہ سے یہ بھی نہ نکلا کہ کم از کم اس یادگار کو لیتی جاؤ۔

اس دھکے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ چار دن تک بستر سے ہلا نہیں احباب عیادت کو آتے تھے اور اُن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی، بظاہر مجھے کوئی بیماری نہیں تھی، لیکن میرا دل بیمار تھا، رگ رگ میں نشتر چبھ رہے تھے۔ پانچویں دن میں اٹھا اور اپنی ملکۂ سبا کی تلاش میں چلا۔ بنارسی باغ میں اُس کا پتا نہ تھا، قیام گاہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی کل وہ کسی پہاڑی مقام پر چلی گئی ہے کیونکہ عرصے سے اس کی صحت خراب ہو رہی تھی اور ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ پہاڑ کی آب و ہوا اس کے لیے ضروری ہے۔"

اب میری دنیا میں ہر طرف اندھیرا گھپ تھا اور مجھے کچھ نہیں سوجھتا تھا، اس کے بعد لکھنؤ میں رہنا میرے لیے دشوار ہو گیا، ایک ایک چیز سے اس کی یاد آرہی تھی اس کے آخری الفاظ میرے دل میں چٹکیاں لے رہے تھے۔ جس محبت کو میں "فلاح

دارین" سمجھے ہوئے تھا وہ ایسی جھوٹی نکلی! میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا مگر میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ایسی حالت میں کیا کرتا؟ اس کی بے بسی بھی ایسی ہی ہوتی۔

میں نے لکھنؤ چھوڑ دیا، میرے حواس مختل ہو گئے، کسی کام میں میرا جی نہیں لگتا تھا۔ اس تاریخ سے آج تک یونہی اسی ہیئت سے دن گزر رہے ہیں۔ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے کرشن کماری رہتی ہے مجھے نہ کھانے پینے کا ہوش رہتا ہے نہ گردوپیش کی باتوں کا، نہ کوئی مستقل صورت معاش ہے اور نہ اس کی فکر، میں جینے ہی سے بیزار ہوں۔ آہ! میں نے اُس کو اپنی بیوی کیوں نہیں بنایا؟ مجھے اس وقت کیا ہو گیا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس روز مجھے کیا ہو گیا تھا۔

لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے ہیں۔ میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھتا اول اول عزیزوں اور دوستوں نے چاہا کہ میں شادی کر لوں اور اپنی حالت کو سدھاروں، مگر میں کیا کروں مجھے دنیا کی ہر عورت کوڑھی نظر آتی ہے۔

برسوں سے اسی طرح مارا مارا پھرتا ہوں۔ اگر زیادہ عرصے تک کہیں ٹک جاؤں تو سارے بدن میں ایک طرح کا درد پیدا ہو جاتا ہے۔ چار برس تک میں نے کرشن کماری کو نہیں دیکھا اور نہ یہ پتا چلا کہ وہ کہاں ہے؟ لیکن میں گزشتہ سال لکھنؤ آیا تھا تو معلوم ہوا کہ وہ راہبہ ہو گئی اور یہیں رہتی ہے۔ میں نہ جانے کیوں اُس سے ملنے گیا مگر اُس نے ملنے سے انکار کر دیا۔

کیا آپ یقین کریں گے اگر میں کہوں میرے دل میں ایک داغ پڑ گیا ہے جو ہر وقت جلتا رہتا ہے اور مجھے بے چین کیے رہتا ہے یہ اُس داغ کا جواب ہے جو کرشن کماری کے سینے پر ہے۔

میں اپنے کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اُس دن گونگا کیوں ہو گیا تھا، میں نے کیوں نہیں اسی جوش اور امنگ کے ساتھ کہا۔

"ہاں کرشن کماری! میں اب بھی تم کو چاہتا ہوں اور اسی گھڑی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں"

لیکن میرے مقدر میں تو یوں خاک چھانتے پھرنا تھا، اب آپ ہی لوگ بتائیے کہ میں محبت کو کیا سمجھوں؟ آہ! زندگی کیسی ظالم نکلی؟ آخر قدرت کی بے دردیوں کی کچھ انتہا بھی ہے؟

رات کے تین بج گئے تھے، بیگانہ نے اپنی عبرت انگیز کہانی ختم کردی، تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بخود ہم لوگوں کی طرف سے خالی الذہن ہو کر تھوڑی دیر ایک شعر گنگناتا رہا۔

چار بجے کے قریب ہم لوگوں کو پھر نیند آگئی، دن چڑھے آنکھ کھلی تو ہمارا مہمان جا چکا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے کس حال میں ہے اور کہاں ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟

اس کی داستان محرومی سن کر اتنا اثر ہم لوگوں کو ضرور ہوا کہ اب کبھی محبت یا زندگی کے مسئلہ پر کچھ کہنے کے لیے دل نہیں ابھرتا۔

⸻ ❖ ⸻

بھری دنیا میں

اُن دنوں تم سچ مچ کنول کا پھول تھیں۔ تمہاری پتیوں پر اگر کوئی بوند آ گرتی تو صرف پھسل کر گر جانے کے لیے، تمہاری پنکھڑیوں کا ہلکا ہلکا گلابی رنگ جو مرمریں سفیدی میں مبہم سی جھلکی مارتا تھا۔ بالکل شفق کے مشابہ تھا، تم ہنستی تھیں تو صرف اس لیے کہ تم ہنسنے پر مجبور تھیں، مگر تمہارا رونا تمہاری بے لوث ہنسی سے بھی زیادہ لذت آمیز تھا۔ ایک مرتبہ تمہاری جھولی سے مکئی کے بھونے ہوئے دانے گر پڑے، تو تم بالکل اس بچے کی طرح رونے لگیں، جس کا پتنگ کٹ گیا ہو۔ ایک مرتبہ میں نے تمہیں محض چھیڑنے کے لیے "ظالم" کہا۔ تو تم بت کی طرح جم کر رہ گئیں اور جب میں نے غور سے تمہارے چہرے کی طرف دیکھا تو تمہاری آنکھوں کی کٹوریاں چھلکنے کے لیے پلکوں کی ایک جھپک کی محتاج نظر آئیں ننھے ننھے دکھوں پر جی بھر کے رونا ذرا ذرا سی بات پر دل کھول کر ہنسنا تمہارے وجود کی محبوبیت کا سب سے موثر عنصر تھا۔

بھادوں کی بھیانک دوپہروں میں تم کتنی دیر تک صرف مجھے دیکھنے کی خاطر چھت پر بیٹھی پرنالا درست کرتی رہیں۔ پوس کے ٹھٹھرے ہوئے اندھیارے میں تم نے ٹڈوں کی پیں پیں سے لبریز کھنڈروں میں میری راہ دیکھی ساون کے امڈتے ہوئے کہرے میں تم بھیگی ہوئی گلروں پر صرف میرے انتظار میں بیٹھی بوجھل ہواؤں کے تھپیڑے سہتی رہیں اور پھر جب تم میرے قریب ہوتی تھیں تو تمہاری آنکھوں میں چراغوں کی لوئیں کانپنے لگتی تھیں، تمہارے دل کی دھڑکن کے ساتھ تمہاری ناک کی بیروئی

توسیں، اور مہین مڑے ہوئے بالوں کے نیچے تمہاری کنپٹیاں اور بکھری ہوئی لٹوں سے ڈھکی ہوئی تمہاری گردن کی رگیں بھی پھڑکنے لگتی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں کے گہرے گوشوں میں مسکراہٹ اور لاج کی ہاتھاپائی سے ایک دلاویز کیکپی سی پیدا ہوتی تھی اور تمہاری کلائیوں میں گڑی سبز، اودی اور گلابی چوڑیوں کے چھنکے ایک عجیب غیر مرئی سا تسلسل اختیار کر لیتے تھے۔

ان دنوں تم کتنی غریب تھیں، تمہارے چولوں کے روزنوں میں سے جب تمہارے جسم کا کوئی مستور حصہ نمایاں ہونے لگتا، تو تم روشنی کی اس شعاع کو روکنے کی کتنی عجیب غریب ترکیبیں سوچتی تھیں، مگر میری معصوم محبوبہ، بانہوں اور ہاتھوں اور کھلے بالوں سے اگر انسان ستر پوشی کر سکتا تو آج تک اسے لباس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ اُن دنوں تمہارے سیاہ رنگ کے چولے کی سفید کھدر کی جیب میں بھونے ہوئے چنے ہوتے تھے اور تم پیپرمنٹ کی ایک ننھی سی پڑیا کو ہفت اقلیم الفت کے خزانوں سے زیادہ وقیع سمجھتی تھیں۔

تم نے میرے عنفوان شباب کے باغی اور کوتاہ اندیش تقاضوں کو قدم قدم پہ سہارے دیے، تم نے میری زندگی کے اس نئے موڑ کو خوشبوؤں اور رنگوں اور روشنیوں سے مزین کیا تم نے میری چال ڈھال کی بجائے میرا دل دیکھا، جو خالص دیہاتی تھا اور جسے اس حقیقت کا شدید احساس تھا کہ گونجتے ہوئے بازاروں اور گرجتے ہوئے کارخانوں میں انسانی روح پر ایک جھلی سی چپک جاتی ہے۔ جسے عرف عام میں تہذیب کہتے ہیں، اور جو دراصل چند ناگزیر مجبوریوں کا ایک نہایت ہی بھونڈا مرکب ہے۔

راجندر سٹریٹ کی منہدمہ مینشن کے فلیٹ نمبر ۱۳-اے کی بیرونی کھڑکی کا دروازہ کھولتے ہی میری نظر تم پر پڑی، یا تمہاری نظر مجھ پر پڑی، بہرکیف تنگ آ ہوں نے تنگ گلی کی مسافت ضرور طے کی، کیونکہ دو کھڑکیوں کے درمیان دیر تک ایک سنہری تار سا معلق رہا، تم اس وقت

کھلے بالوں کو پیٹھ اور شانوں پر بکھیرے نیچے گلی میں کسی ظروف فروش سے ایلومونیم کی ایک نہایت بوسیدہ دیگچی کا نرخ طے کر رہی تھیں، مجھے دیکھتے ہی تم نے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے مگر تمھارے بالوں کی ایک لٹ باہر لٹکی رہ گئی، مجبوراً تم نے کھڑکی کو کھولا اور حیا آلود مسکراہٹ تمھارے لبوں پر بکھر گئی اور ظروف فروش نے چونک کر اور کھڑکھڑاتا ہوا ٹوکرا اٹھا کر کہا "بڑے شہروں میں یہ بڑی خرابی ہے۔"

ان دنوں میں ایک دفتر میں کلرکی کی درخواستیں دے رہا تھا اور تم ایک ہیڈ کلرک کی بیوی تھیں۔ ایک ہیڈ کلرک صاحب اتنے محنتی واقع ہوئے تھے کہ دس گیارہ بجے دفتر سے واپس آتے اور جب وہ اپنے کمرے میں بتی بجھا کر اور "رام نام ست ہے" کا نعرہ لگا کر سو جاتے تھے، تو تم نہایت دردناک سروں میں "جس تن لاگے وہی تن جانے" گایا کرتی تھیں۔

ایک دن تم سیڑھیوں میں بیٹھی ایک خوانچے والے سے گول گپے خرید رہی تھیں، میں
بھی زندگی میں پہلی مرتبہ گول گپوں کا ... رک گیا۔ دو کھائے اور چھ
نالی میں پھینک دیئے۔ خوانچے والے ... گھونگھٹ میں ہنسی کو
لپیٹنے کی ناکام کوشش کرتی رہیں او... یں ہاتھ ڈالا تو
تم نے کہا تھا۔ "مجھے آپ کا ... رہی ہوں۔" وہ لیکن
ابھی حساب ختم نہیں ہوا، ... ہنستے ہوئے ٹوپی کو درست
زاویے پر جماتے ہوئے کہا ... بی بی جی ختم ہوا ہے بابو جی، حساب
تو سدا چلتا رہے گا۔"

جنگ کے زمانے میں اکنی کی قیمت بہت گر گئی ہے۔ ویسے بھی اکنی صرف چار پیسوں کا مرکب ہوتی ہے۔ مگر مجھے وہ اکنی مرتے دم تک نہیں بھول سکتی جس سے ...نے حساب چکانے کی کوشش کی تھی، حکومت بدل جائے، اکنیوں کے کنارے اڑا دیئے جا

اکنی کا وجود ہی باقی نہ رہے میرے نزدیک دنیا کی تمام حکومتوں کا معزز ترین سکہ اکنی ہے جو دو انسانوں کے درمیان ایک ستارے کی طرح چمکا اور تیسرے انسان کی ڈاسکٹ میں غروب ہو گیا اور تینوں کی آنکھوں کو چمکا گیا۔

ہیڈ کلرک کی اُداس بیوی، تم نے مجھے اکنی کے گول گپّے کھلائے اور اس کے بعد دیر تک کھڑکی کھولے کوئی کتاب پڑھتی رہیں اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی رہیں اور پھر مجھے کتاب اور کن انکھیوں کا محتاج نہ پاکر تم مسکرائیں میں نے خلا میں باہیں اٹھا کر ہوا کو سینے سے لگایا اور تم شرما کر پیچھے ہٹ گئیں اور جب رات کو لالہ جی دفتر سے واپس آئے تو خلاف معمول ان کے کمرے کی بتی دیر تک روشن رہی۔ گیت کے بول تمہارے لبوں پر ناچنے کے لیے دیر تک گلی کی نیم اجلی فضا میں پھڑ پھڑاتے رہے، تمہارے مکان سے ٹھیس ٹھک ٹھیس کی عجیب و غریب آوازیں آتی رہیں اور جب میں صبح کو اٹھا۔ تو مہترانی کی زبانی معلوم ہوا کہ تم صبح چار بجے کی گاڑی سے لالہ جی کے ہمراہ مکتسر چلی گئی ہو اور اب تم وہیں رہو گی۔ کیونکہ لالہ جی ... پیدا ہونے والا بچہ بھارت ماتا کا بچہ ہونے کا ... نہ جانے ... شریف ہندوستانی عورت کی طرح اب تک تمہارے ... تمن کالی ماتا کی بھینٹ چڑھ چکے ہوں۔ چیتہ مستقل طور پر ... باقی اسکول میں "یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا" ... یاد رکھو کہ تمہاری یاد کو چکوں کی یہ افراط میرے دل سے محو نہیں کر سکتی۔ تم نے ان دنوں میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ جب میں خود مسکراہٹوں کا مفہوم تک بھول چکا تھا۔ میں ان دنوں آوارہ و بدنصیب تھا اور تم بجلی کی سبز روشنی میں میرا بانی اور چینڈی داس کے بھجن اور گیت گاتی تھیں، مگر تم نے مجھے محض ایک انسان سمجھ کر چند مسکراہٹیں اور ایک اکنی عنایت کی اور

اس ہندوستان میں جہاں خاندان، تعلیم، فیشن اور مغربیت، شخصیت کی تعمیر کے نہایت ضروری عناصر ہیں، انسان سے محض اس کی انسانیت کی بنا پر محبت کرنا الہ دین کے چراغ کی طرح ناپید نہیں ہوا اور میری گول مٹول زرد رُو اداس چشم محبوبہ، تو اسی محبت کی ایک پابہ زنجیر نمائندہ تھی۔

جب میں نے پہلی مرتبہ تمہارا افسانہ پڑھا تو یہی اندازہ لگایا۔ کہ تم خود نہیں لکھتیں بلکہ الفاظ و معانی کے یہ خوبصورت تاج محل اپنے کسی چاہنے والے، یا خاوند یا کسی عزیز سے تعمیر کراتی ہو۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں بھی افسانے لکھ سکتی ہیں، وہ عورتیں جنھوں نے عمر بھر ڈیوڑھی سے باہر قدم نہیں رکھا، جو چولھے سے بستر تک کے چکر میں عمر بھر گرفتار رہیں، جن کی مسکراہٹیں ان کے لبوں میں پھنسی رہیں اور جن کے آنسو ان کے آنچلوں میں جذب ہوتے رہے، جو تنہائیوں میں روئیں اور تنہائیوں میں ہنسیں، جنھوں نے مرتے دم تک اپنی زبان سے اپنے خاوند کا نام نہ لیا، جنھوں نے آ... کو صحن کی وسعت کے ذریعے ناپا اور جن کے لیے چاند بالاخانے کی اوٹ میں جا غروب ہوگیا، تم ہی سوچو کہ آخر وہ پہلا اندازہ فطری تھا یا نہیں۔

لیکن جب میں نے تمہارا دوسرا افسانہ پڑھا تو میں تم... اس درجہ متاثر ہوا کہ تمہیں خط لکھ ڈالا، تم نے کتنی نرمی ... مسلسل خطوط کے رسیلے تکلفات میں غیر محسوس طور پر بے تکلفی ... گویا کہ دونوں کی روحیں جھلس گئیں۔

میں نے تم سے تصویر طلب کی، تو تم نے محض اس لیے انکار کر دیا کہ — "تصویر حقیقت کا صرف پرتو ہے، حقیقت نہیں اور میں انتہا درجے کی حقیقت پرست ہوں، میں خدا کو بھی ایک اٹل حقیقت سمجھتی ہوں، میرا مذہب حقیقت ہے، میرا فن حقیقت ہے۔"

نئی دہلی کے کافی ہاؤس میں ہم مقررہ تاریخ اور وقت پر اکٹھے ہوئے لیکن میں تمھیں پہچان نہ سکا ـــــ میرے تصور میں جن بڑی بڑی آنکھوں نے چراغ جلائے تھے وہ کہاں تھے۔ جن کے رس نے میری تنہا راتوں میں خمار گھول دیے تھے۔ وہ بوٹا سا قد، وہ چھریرا بدن، وہ لانبے بال ـــــ یہ سب کچھ کہاں تھا، میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر تم اپنے اس سرمایے کو کہاں چھوڑ آئیں اور وہ بے پلکوں کی چندھی آنکھیں اور پچکے گال اور بھٹے پھیلے ہونٹ، ٹھنگنا قد، بھدا بدن اور بھوسیلی بے رونق جٹائیں کہاں سے اٹھا لائی تھیں اور پھر تمھارا سیاہ رنگ اور پیلے دانت اور ہولناک تصنع آمیز ٹین کے کنستر کی طرح پھٹی پھٹی، بھرائی بھرائی "ہیلو ڈیر مسٹر منیجر۔"

اس وقت میں نے سوچا تھا کہ کاش مذہب اور قانون میں خودکشی کرنا جرم نہ ہوتا، لیکن اب مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہے اے حقیقت پرست ادیبہ! تم نے میرے تصورات کو ایک عرصے تک انتہا درجے کی فن کارانہ چابک دستی سے بہلایا ہے، میں جانتا ہوں کہ حقیقت تلخ ہوتی ہے، اور تم سے مل کر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا حقیقت سیاہ رو اور بھدی بھی ہوتی ہے لیکن وہ لمحے کبھی مجھے نہیں بھول سکے، جب نے تمھیں خطوط کی بجائے کتابچے لکھے اور اس محبوب مصروفیت کے عالم میں یہ سوچنے نہ ملا کہ حقیقت پرست ہمیشہ رومان کی تخلیق کرتے ہیں اور رومانی ہمیشہ پرست ہوتے ہیں اور وقت تیز رفتار ہے اور زندگی مختصر ہے!

تجھے کیسے عجیب انداز سے دیکھا تھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو، تمھارے لبوں پر دعوت بھی اور آنکھوں میں خاموش مزاج پرسی۔

کھیت کو کاٹتے جاؤ میرے دہقان بھائیو، درانتیوں کی وحشت میں کمی نہ آنے پائے کھیت کا آخری کنارا تمھارا افق ہے۔ درانتیوں کے ہلال اسی شاداب افق پر غروب

ہونے چاہئیں ورنہ تمہاری محنت ادھوری رہ جائے گی اور اُدھر ہماری کہانی ادھوری رہ جائے گی اور...... اور ادھوری کہانیاں مجھے قطعی نہیں بھاتیں، مجھے کوئی ادھوری چیز نہیں بھاتی۔ میں کائنات سے بھی تو اسی لیے مطمئن نہیں کہ اس کے خالق نے جلد بازی سے کام لیا اور ابھی زمین کا طواف کرنے کے لیے چندا اور چاند اور خود زمین کے چندا اور مسجود سورج ڈھالے جا رہے تھے کہ آدم نے گندم کا دانہ کھایا۔

دہقان اپنے کام میں مصروف رہے، اور تم نے کھنڈر کی اوٹ میں ہو کر اپنی آنکھوں کو ایک عجیب سی حرکت دی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہوں "قریب آجاؤ" اور جب میں تمہارے قریب آیا تو تم نے ہنستے ہوئے کہا تھا "میں شور مچا دوں گی ـــــ" اور ان الفاظ میں کتنی دھڑکتی بھڑکتی ہوئی سرگوشیاں پنہاں تھیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ تم اس گاؤں کی سب سے فراخ دل حسینہ ہو، تمہارا نوجوان خاوند لیبیا کے محاذ پر مر چکا ہے اور تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو جس کی چار دیواری پست ہے اور جس کے دروازے کی زنجیر محض چھونے سے کھل جاتی ہے۔ تم شام کے بعد فوجی سپاہیوں کے پیش کیے ہوئے قسم قسم کے عطر لگاتی ہو اور تمہارے پاس ایک بستر ہے جو لکھنؤ کے ایک تعلقہ دار نے ایک پنجابی باورچی کو انعام میں دیا اور پنجابی باورچی نے یہ بستر ایک سپاہی کے ہاتھ چمڑے کی ایک چھاگل کے عوض بیچ ڈالا اور فوجی سپاہی نے یہ بستر اس شرط پر تمہارے حوالے کر دیا کہ تم مرتے دم تک صرف اسی کی یاد میں اس پر اکیلی سوؤ اور اگر ہو سکے تو اس پر لیٹ کر رات آنکھوں میں کاٹو اور تارے گنو اور جھینگا ڈروں کو اڑتا دیکھو۔

اسی بستر پر بٹھا کر تم نے میری جیبوں کی تلاشی لی اور سات روپے سوا سات آنے نکال کر تکیے تلے رکھ لیے اور پھر تم نے میری سگریٹ کی ڈبیا اور رومال اور محبوبہ ایک ننھی سی کی تصویر بھی نکال لی۔

تمھاری محبت سستی اور تمھارا بستر میلا تھا، مگر تمھاری بیباک ہنسی اور چمکتی ہوئی آنکھوں نے مجھے بتایا کہ اگلے لوگ عورت کے متعلق نہایت محدود معلومات رکھتے تھے وہ عورت کی حیا کو اُس کے حُسن پر غالب سمجھتے تھے اور تم حیا کے اس احساس سے یکسر عاری تھیں، مگر تمھارا جسم خوبصورت تھا، تمھیں ورغلانے کے سینکڑوں ڈھب آتے تھے اور تم ان لوگوں کی ہنسی تک اُڑا سکتی تھیں، جو تمھاری شبستان کی رنگینی پر طعنہ زن ہوتے تھے، اور اگرچہ گاؤں میں میرا قیام مختصر تھا اور میری موجودگی ہی میں محاذِ رما سے چند سپاہی اٹھائیس دن کی چھٹی پر آنکلے تھے اور تمھارے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی مونچھیں اکڑ جاتی تھیں اور طُرّے پھیل جاتے تھے اور پھر ایک رات کو تمھارے دروازے کی زنجیر میرے لیے ہندوستان کے آئینی تعطّل کی صورت اختیار کر گئی، مگر تم میرے خیالوں میں مدّتوں سے محوِ پرواز ہو۔ اس لیے کہ تم روپے سے خریدی جا سکتی تھیں مگر لوگوں کی دھمکیاں اور ہم جنسوں کے طعنے تمھاری مصروفیتوں میں ایک لمحے کے لیے بھی خلل نہ ڈال سکے۔

گاؤں سے دور ریت کے سنہری ٹیلوں کے درمیان بہت ہی سیدھی اور قوسی کھجوروں کے سلسلے تلے تمھارے خیمے نصب تھے، ٹیلوں کی لہروں پر میں نے تمھارے قدموں کے نشان دیکھے جو مجھے اس کھجور کے درخت تک لے آئے جس کے ڈالیوں میں بیٹھی تم دف بجا رہی تھیں اور گا رہی تھیں:-

گوری بال بکھیرے	جیسے ساتھی	نرم طلائی تاریں[1]
گوری اکھیاں ملیاں	جیسے ساتھی	تارے جھلکی ماریں

---

[1] نماندہ حشوں کو مذکر و تانیث کی غلطیوں کے لیے معاف کیا جا سکتا ہے۔

اُڑتی ہوئی ابابیلوں نے غوطہ مار کر تمھارے خیموں کا چکر لگایا، لیکن انھیں اُلھڑ موسیقی کا وہ منبع نہ مل سکا۔ جن سے نقرئی تانوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور ہوائیں تھم گئی تھیں اور کرنیں جم گئی تھیں اور سایے رک گئے تھے۔ میں نے کھجور کے نیچے پہنچ کر کہا "خانہ بدوش لڑکی مجھے شہر جانا ہے اور تمھارے خیموں نے پگڈنڈی کو ڈھانپ لیا ہے۔" تم نے کہا تھا "بھولے مسافر، پگڈنڈیاں خیموں سے چھپ سکتیں تو کوئی مسافر منزل تک نہ پہنچ سکتا۔" میں نے کہا تھا "خانہ بدوش لڑکی، نیچے اتر کر مجھے راستے پر لگا دے۔ اصل میں پگڈنڈی کا تو بہانہ تھا، پرلے خیموں کے قریب مجھے چند لدّاخی کتے نظر آرہے ہیں اور مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔" تم نے جواب دیا تھا "بھولے مسافر، اگر لدّاخی کتے ایسے ہی خوفناک ہوتے تو بادشاہوں کو فوجیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" تنگ آکر میں نے کہا تھا "میں تمھیں ایک روپیہ دونگا ــــ" اور تم دف کو نیچے ریت پر پھینک کر گلہری کی طرح کھجور پر سے نیچے اتر آئی تھیں اور جب تم اتر رہی تھیں خوبصورت گلہری تو میں نے تمھیں خوب جی بھر کے دیکھا۔ تم نے بالوں میں کیکر کے پھول سجا رکھے تھے اور تمھارے گلے میں سمندری گھونگوں کی ایک مالا تھی اور تمھاری کلائیوں میں سیپیوں کے کڑے تھے اور تمھارے پاؤں ننگے تھے۔ ٹخنوں پر پیتل کی پازیبیں تھیں مگر وہ بجتی نہ تھیں۔ صرف چمکتی تھیں، تمھاری گھگری کا بالائی کنارا کمر میں پیوست ہوچکا تھا اور تم نے انگیا کا ایک جعلی نمونہ یعنے ایک چولی پہن رکھی تھی۔ جو ناف کے قریب مختلف رنگوں کے ریشمی دھاگوں کی ایک کمان سی بناتی تمھاری سانولی پیٹھ کی طرف دوڑ گئی تھی اور تمھاری پیٹھ کا رنگ کتنا دلآویز تھا۔ دھوپ کی کرنوں کا رس اور ریتلی آندھیوں کی شدید تیزی اور بے وقت بارشوں کی سوندھی خوشبوؤں نے تمھاری پیٹھ کے علاوہ تمھارے چہرے، بازوؤں اور پنڈلیوں کو بالکل چیا کلیٹ بنا دیا تھا۔

اس وقت تمام مرد قصبے میں بھیک مانگنے، ریچھ نچانے اور گیت گانے جاچکے

تھے اور خیموں کی پرلی طرف صرف کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریت پر پاؤں رکھتے ہی ننھے ہرن کی سی ایک چوکڑی بھری اور دف اٹھا کر میرے پاس آئیں اور ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے کہا "گیت سناؤ گی؟" تم نے جواب دیا "ایک روپیہ اور بھی لونگی۔" میں نے کہا "مجھے خانہ بدوشوں کا ناچ دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔" تم نے جواب دیا "پانچ روپے ناچ کے لونگی۔" میں نے کہا "میں تمھیں گانے اور ناچ اور لداخی کتوں سے بچانے کے دس روپے دونگا۔"

تم نے گیت گایا، تم ناچیں، پرلے خیموں سے کئی بچیاں بھاگی آئیں، ایک بڑھیا کھسک کر خیمے کے دروازے پر آ بیٹھی اور پھر جب تم نے جسم کے تمام امکانی خموں کو ایک نہایت ہی تیز ناچ میں سمو کر دف پر آخری تھاپ دی اور دف کے بیرونی دائرے پر بندھی ہوئی تانبے کی پتریاں اور گھنگرو چھنچھنا اٹھے تو میں نے ہولے سے کہا تھا۔ میں بھٹک جانا چاہتا ہوں میں راستہ نہیں پوچھوں گا۔"

اور تم مجھے ہاتھ سے پکڑ کر بھگاتی ہوئی خیموں سے پرے چھوڑ آئی تھیں میں نے کہا "چنچل گلہری میں کل پھر آؤں گا۔" اور تم نے جواب دیا تھا "بھولے مسافر خانہ بدوش کل کو کیا جانیں، وہ صرف آج کے بل پر زندہ ہیں کل یہاں نہ خیمے ہوں گے، نہ لداخی کتے ہوں گے، نہ شاماں ہوگی صرف سرد راکھ کے ڈھیر ہوں گے اور بے شمار قدموں کے نشان۔"

اور پھر تم نے اپنے سکوت کی زبانی کہا تھا "زندگی کے اس کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مجھے تو ایسی کئی منزلیں ملیں۔ اس ریگ زار میں ان گنت نخلستان آئے لیکن ہم خانہ بدوش ہیں۔ ہمارا مذہب سفر ہے ہماری زندگی سفر ہے ہماری موت سفر ہے اور بھولے مسافر تم مجھے ایسی التجی نظروں سے نہ دیکھو کیونکہ میں نے جو روپے تم سے لیے ہیں وہ گیت اور ناچ کی اجرت ہیں اور سایے ڈھلنے کو ہیں اور خانہ بدوش

قصبے سے پلٹنے کو ہیں، اور اُن کی بالشت بھر لمبی مونچھیں ہیں اور خونی آنکھیں ہیں اور کانوں میں بڑے بڑے بالے ہیں اور انھوں نے نیفوں میں خنجر اڑس رکھے ہیں۔"

تمھارا پیکر ــــ میری خانہ بدوش محبوبہ ــــ میرے تصورات کے کہرے میں کوندے کی طرح لپک جاتا ہے اور وہ لمحہ اب تک میرے ماضی اور مستقبل کو محیط کیے ہوئے ہے۔

سٹینڈرڈ کے آئینہ وش فرش پر تمھاری بے قرار مگر متوازن گردشیں اور تمھارے ہونٹوں سے ــــ کارستہ ہوا فردوسی شہد۔ ویسٹر کے سگاروں اور کریون کے سگرٹوں کے اُڑتے ہوئے دھوئیں میں ہارپر اور فوروزز کی بکھری ہوئی خوشبوئیں، کافی اور چائے کی پیالیوں سے اُٹھتی ہوئی دھندیں، فرش کی مرمریں مثمن خشتوں میں، چھت پر ــــ کے حروف ابھارتے ہوئے برقی قمقموں میں ــــ تمھارا ایک وجود بے شمار سایوں میں بٹ کر تھرک رہا ہے، لپک رہا ہے، تمھاری راہ میں دیواریں کیوں حائل ہیں، تمھاری پروازیں اتنے خم کیوں ہیں؟ تم ایک ہی دائرے میں کیوں محبوس ہوئی جا رہی ہو؟ ان دیواروں کو رقص کے ایک وحشیانہ چکر میں تڑاخ سے توڑ دو، اور باہر نکل جاؤ، سڑکوں پر سے خیابانوں میں سے اور اکّا دکّا بنگلوں کے گورکھ دھندے سے نکل کر اور نہر پر سے اُچک کر کھلے سبزہ زاروں میں داخل ہو جاؤ، بڑھتی جاؤ، گاتی جاؤ، حتیٰ کہ زمین کی آخری بلندی سے (اگر زمین گول نہیں ہے) نیلے خلا میں چھلانگ لگا دو، اور ایک ستارے کی طرح ــــ

مگر نہیں، تم سٹینڈرڈ کے آئینہ وش فرش پر ناچ رہی ہو اور بار بار میری طرف کچھ اس ڈھنگ سے دیکھتی ہو، جیسے میں نہ ہوتا تو سارا سٹینڈرڈ ویران رہ جاتا، اگرچہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حاضرین میں سے ہر شخص کے دل میں یہی گمان گزر رہا تھا، مگر سٹینڈرڈ کے باہر مال کی پٹڑی پر تم نے اپنا سرسراتا ہوا گاؤن سنبھالتے ہوئے مجھے بڑی احتیاط سے دیکھا تھا اور کار میں بیٹھتے ہوئے تم نے اپنے ہاتھ کو ذرا لہرایا تھا، میرے قصبے میں کھرتے

ہوئے آر' اے' ایف کے ایک نوجوان کو شاید مغالطہ ہوا کہ اُس کی طرف متوجہ تھیں' اور جب تمھاری کار اسمبلی ہال کے سامنے سبز روشنی کے سیلاب میں بہ گئی' تب بھی وہ نوجوان ــــ آہ بےچاری انسان کی نادانی ــــ چُپ چاپ وہیں کھڑا رہا اور سگریٹ اس کی انگلیوں میں بیکار جلتا رہا اور خلا میں اس کی نظریں پرے کی طرف گھستی چلی گئیں!

دوسرے روز تم سٹینڈرڈ میں مجھے اپنا منتظر پاکر مسکرائیں اور پھر ادھر اُدھر دیکھ کر نہ جانے کیوں اُداس ہوگئیں' آرکسٹرا کی طرف ایک نگاہ اٹھاکر تم نے ایڑیوں کو فرش پر پٹخا اور ایک عجیب چیختا اور بلکتا ہوا آہنگ پیدا کرتے ہوئے تم نے ــــــ کی دلاویز تانوں سے میرے ذہن کو' میرے ماحول کو' میری کائنات کو' زندگی کی ان مسرتوں سے معمور کردیا' جو شاید اب سے پہلے لاشعور میں سو رہی تھیں اور پھر میں بھٹک گیا' تمھارے اُداس گیت اور تمھارے اُداس رقص اور تمھارے اُداس انداز کے باوجود بھٹک گیا' میں تمھارے ہمراہ الجیریا کے سنہری ساحلوں پر گھومتا پھرا' بحیرۂ روم کے نیلے پانیوں پر برق رو کشتیوں میں اُڑا' عدن کی پہاڑیوں میں بھٹکا' مکران کے بلوچی گیت سنے' چوپاٹی کی رومانی شاموں میں نہایا' شمالی ہند کے سبزہ زاروں میں ٹہلا' برہم پتر کے ڈیلٹا پر ہم بچوں کی طرح ننھی ننھی چھتریوں میں چھینٹے اڑاتے پھرے اور میں تمھیں امریکا کی اُن اَن گنت جنگلوں میں لے گیا' جو بحرالکاہل کی بےکنار وسعتوں میں ناریل کی چھتریوں تلے پوشیدہ تھیں ــــ اور پھر جب آرکسٹرا بند ہوا ــــ جب آرکسٹرا بند رہا ــــ

تمھاری یاد میری زندگی کی ضامن ہے' جس طرح گھنگھور گھٹا کے اندھیرے میں سورج کی چند بھٹکی ہوئی کرنیں ایک لمحے کے لیے دن کا احساس تازہ کرجاتی ہے

میں بیمار ہوں' میری رفیقۂ حیات' ڈاکٹر نے مرغن کھانے منع کر رکھے ہیں'

شلغم کے ننھے ننھے قتلے پانی میں اُبال کر اور ان پر سیاہ مرچ چھڑک کر میرے پاس لے آؤ، اور پانی کو ایک مرتبہ گرم کر کے ٹھنڈا کر لو، اور پودینے کی چٹنی میں انار دانہ کی بجائے ہینگ کا مہین سفوف چھوڑ دو اور دیکھو، تمھیں کل شام سے زکام ہو رہا ہے۔ لعوق سپستاں چاٹ لو یا بنفشہ، عناب اور اسطوخودوس کا جوشاندہ تیار کر لو، میں مدت سے انگریزی سیرپ پیتے پیتے مجبوراً طب یونانی کا قایل ہو گیا ہوں، اپنی صحت کا خیال رکھو۔ میری جان تمھارے بغیر میری زندگی اُجڑ جائے گی۔

تکیے کے ارد گرد گلاب کے پھول رکھنے سے تمھیں میں نے کئی مرتبہ منع کیا، مگر تمھارے کان پر ـــــ یہ بہت پرانا محاورہ ہے ـــــ تمھاری گردن پر چیونٹی تک نہیں بھاگتی ـــــ گلاب کی خوشبو سے مجھے دردِ سر کی تکلیف ہو جاتی ہے اور آخر مجھ ایسے دبلے پتلے انسان کے لیے اتنے بڑے پلنگ اور ان پر چار تکیوں اور اتنے لمبے چوڑے لحاف کی کیا ضرورت تھی بھئی مجھے تمھاری اس عادت پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے، کہ میں بول رہا ہوں، بولے جا رہا ہوں، اور تم فرش کو گھور رہی ہو، گھورے جا رہی ہو، کوئی بات کرو، کچھ بولو، خفا ہو جاؤ، میری بات ماننے سے انکار کر دو۔

تم میرا سویٹر بُن رہی ہو، اور ادھر بچہ رو رہا ہے اور مجھے ایک ضروری ڈرافٹ تیار کرنا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ دیسی شراب پر مزید ٹیکس لگایا جائے، کیونکہ بدیسی شراب ٹھیک طرح نہیں بک رہی ہے، ٹیکس کے فواید کے ہمراہ ہمیں اس نقصان کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں شراب نوش عدم تعاون کا اعلان نہ کر دیں اور سرکار گھاٹے میں نہ رہے، اس لیے کمیٹی نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ ایکٹ آبکاری کی دفعہ ـــــ بچہ بدستور روئے جا رہا ہے اور تم بدستور سویٹر بنے جا رہی ہو، اور میرا ڈرافٹ بدستور ادھورا پڑا ہے اور باورچی خانے سے مجھے چیڑ چیڑ کی آواز سنائی دے رہی ہے، پڑوسیوں کی کتیا ہو گی۔ مجھے پڑوسی بالکل نہیں بھاتے۔ یہ کھوجی۔ یہ مخبر۔ یہ خدائی فوجدار ہر وقت سر پر سوار، اور پھر جو پڑوسی کتوں

کے شوقین ہوں انھیں — میرا بس چلے تو — جنوبی افریقہ بھیج دوں یعنی یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ انسان کے استعمال کے برتنوں میں یہ کتے — میں پاگل ہو جاؤں گا میرے دماغ میں کچھ ہو رہا ہے، میرا سر دباؤ، یوں، یہاں کنپٹیوں کے قریب، ماتھے کے وسط میں، کانوں کے عقب میں، گردن کے آس پاس، تالو کے محیط پر — ارے! تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ تالو کہاں ہوتی ہے، فزیالوجی کی کوئی کتاب تم نے نہیں پڑھی، تو پھر تمھیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تمھارا بچہ دودھ پیتا ہے، وہ انسانی جسم کی مشینری کی ایک عجیب و غریب پروسس سے مختلف شریانوں — تم شرما رہی ہو، بہت اچھا، میں ڈرافٹ لکھتا ہوں، تم سویٹر بُنو اور بچے سے کہو کہ اگر رونا بچپنے کے فرائض میں شامل ہے تو شوق سے روئے مگر ذرا ڈھب سے، ذرا ڈھنگ سے — ایک گلے سے چار مختلف آوازیں نکلیں تو —

تم کتنی اچھی ہو میری شاہدہ، کتنی اچھی ہو تم، تمھارے ہاتھوں لہسن اور پیاز کی بُو آ رہی ہے، ہاتھ صاف کرنے کے بعد چند گھڑیوں کے لیے میرے پاس آ بیٹھو، آج میں تمھیں جی بھر کر اپنے سینے سے بھینچوں گا اور تمھارے بالوں — اُفوہ، وہ دیکھو نعیم مٹی پھانک رہا ہے، خدا کے لیے شاہدہ سگھڑ بنو، بچے کا خیال رکھو، ورنہ کل کلاں بچے کے پیٹ میں مروڑ اُٹھے تو الزام مجھ پر نہ دھر لیجیو۔

شاہدہ تم میرے جوتے پالش کرتی ہو، میرے کپڑے دھوتی ہو، میرے لیے کھانے تیار کرتی ہو، میرے پاؤں دباتی ہو، اور میری ذرا سی خفگی پر خوب خوب روتی ہو — تمھارے آنسو دیکھ کر مجھے کتنا رحم آتا ہے — اور مجھے اپنی اہمیت کا کتنا شدید احساس ہوتا ہے میری رفیقۂ حیات۔

دیہات ویران پڑے ہیں۔ شہروں کی تنگ گلیوں میں تیل کی قلت کے باعث لیمپ

نہیں چلتے، ادیبوں کو فلم اور ترقی پسندی نے نگل لیا ہے۔ قصبوں کی بیوہ عورتیں فوجی مرکزوں میں روڑی ڈھو رہی ہیں۔ خانہ بدوش گروہوں نے تجارت شروع کر دی ہے۔ کافی ہاؤس اور ریسٹوران کالے بھجنگ بیروں اور بھدے زرد رو چینیوں سے پٹے پڑے ہیں اور اور ـــــ کے بجائے ریڈیو سٹ شانت مہا ساگر کا رونا رو رہے ہیں اور غرا رہے ہیں اور چنگھاڑ رہے ہیں، پُر امن گھروں میں کنٹرول کی برکتوں نے صد محاذی جنگ کر رکھی ہے، ہر طرف چیخم دھاڑ ہے، افراتفری ہے، دھکا پیل ہے، لوٹ کھسوٹ ہے، دنیا کو دلہن بنانے کی کوشش میں اس کے سارے زیور نوچ ڈالے گئے ہیں۔ اس کے چاہنے والوں کے جبڑوں میں لٹکتے ہوئے تازہ گوشت کے قتلے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں انتڑیوں کے جال ہیں اور اُن کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالائیں ہیں ـــــ اور تم اتنے روپ دھارنے کے بعد بھی نہ جانے میری دسترس سے کیوں دور ہو، اور بادل فضا میں منڈلا رہے ہیں، ندی کے کناروں پر اودے اودے پھولوں کی بساط بچھ رہی ہے اور ندی کا پانی کروٹیں بدلتا ہوا بہ رہا ہے، مگر تم کہاں ہو؟ اب تم بھکارن ہو اور کبھی طوایف (بھکارن کے پاؤں میلے ہیں اور طوایف کو پان کی پیک پھینکنے کا ڈھب نہیں آتا) اب تم کبھی بنگال کی فاقہ کش لڑکی ہو، اور کبھی ساحل مکران کے کسی مچھیرے کی بیٹی (بنگالن کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں اور مکرانی مچھیروں کو مسکرانا نہیں آتا) ـــــ اور مٹھی میں بھری ہوئی ریت روکے نہیں رکتی ننھی ننھی دھاریں بن کر گری جا رہی ہیں۔ سائے لمبے ہو رہے ہیں، ابابیلیں جھیل سے پرے پربتوں کو عبور کر گئی ہیں، جھٹپٹا قریب ہے، مگر گھنے جنگلوں، بنجر میدانوں اور ویران پہاڑیوں پر بکھری ہوئی بے شمار انسانی لاشوں کے تعفن نے مشرقی اُفق کو دھندلا دیا ہے اور ہر طرف کہا نفرنسوں کا طاعون پھیل رہا ہے، اور محبت بے کس اور بے بس ہے، اور احساس لطیف کے خلا میں کوئی پکار رہا ہے "میں اکیلا ہوں، میں اکیلا ہوں"۔

(☆)

آزمائش

جالندھر کے پنڈت جسونت رائے بہت نیک آدمی تھے۔ اُن کے ضبط اور انصاف کی دھوم سارے پنجاب میں تھی۔ کہتے ہیں کہ اُن کا بچپن انتہائی درجے کے افلاس میں کٹا تھا۔ مگر اپنی محنت اور سرگرمی کی بدولت ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔ ہر چند کہ یہ عہدہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ مگر پنڈت جسونت رائے میں غرور کا نام تک نہ تھا۔ وہ غریب سے غریب آدمی کو بھی "آپ" کہہ کر مخاطب کرتے اور بزرگ آدمیوں کے سامنے آنکھ اٹھانے کی جرائت نہ کرتے۔ جو اشخاص بیس روپے کے کلرک ہو کر اپنے والدین سے بات چیت کرنا ہتک سمجھتے ہیں ان کو وہ بہت پھٹکارا کرتے تھے۔

سبھی جانتے ہیں کہ کچہری ترغیبوں کی سرزمین ہے۔ یہاں رشوت لینا اور دینا دونوں گناہ نہیں سمجھے جاتے۔ گرانی کے زمانے میں سَو سَو روپے کے ملازم بہ مشکل گزارا کر سکتے ہیں اور مہینے کے آخری دنوں میں بنیئے حلوائی اور پھل فروش سب سے کچھ قرض منگواتے ہیں۔ مگر کچہری میں بیس کا ملازم بھی کبھی تنگ نہیں ہوتا۔ اُس کا دن روپیہ اکٹھا کرنے اور رات حساب کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ سرکار کا دشمن ہیں اس کے انسداد کے لیے قانون بنائے گئے ہیں سنگین سزائیں دی جاتی ہیں۔ مگر لالچی دل پروا نہیں کرتے۔ زبانیں بولتی ہوئی ہچکچاتی ہیں۔ تو گنہگار آنکھیں مجرم آنکھوں سے نگاہوں ہی نگاہوں میں لین دین کا فیصلہ شروع کر دیتی ہیں۔ کچھ انکار ہوتا ہے۔ کچھ اصرار ہوتا ہے۔ جسم نزدیک سرکتے ہیں۔ سر نیچے جھک جاتے ہیں۔ ہاتھ جیبوں میں داخل ہوتے

ہیں۔ پھر کاغذوں کی سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے اور نوٹ ایک کے قبضے سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پہچانتی ہیں۔ ہاتھ تولتے ہیں دماغ اندازہ کرتا ہے۔ ان باتوں سے حوصلہ پکڑ کر زبانیں بھی کھل جاتی ہیں ایک طرف سے ہلکا سا وعدہ امداد ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے پرزور شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور اس طریقے سے ہر روز وہ ہوتا رہتا ہے۔ جسے سیدھے سادھے لوگ رشوت کہتے ہیں اور لینے دینے والے "بالائی آمدنی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی کے ذریعے شریف بدمعاش چین اڑاتے ہیں اور غریب فرشتے ذلیل ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں اور روپیہ، پیسہ، عزت، طاقت اور حسن کی مانند انصاف کو بھی خرید لیتا ہے

(۲)

ایسے مواقع ہر روز سامنے آئے۔ مگر پنڈت جسونت رائے کی طبیعت ...... ڈانواڈول نہیں ہوئی۔ اگر وہ چاہتے تو دنوں میں ہزاروں سمیٹ سکتے تھے مگر منصف آدمی تھے۔ جو کچھ آیا خرچ ہو گیا۔ شاہانہ طبیعت ہو چکی تھی کبھی پس انداز کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اسی طرح دن گزر رہے تھے کہ لڑکی کی شادی نزدیک آگئی۔ ایک دن بیٹھک میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ خرچ کیسے چلے گا اتنے میں بیوی نے کہا "کچھ خیال ہے؟"

جسونت رائے نے چونک کر بولے "کیا کہوں؟ دن رات یہی فکر کھائے جاتی ہے اب تک آنکھیں بند تھیں۔ اب اپنی فضول خرچیوں پر پچھتا تا ہوں"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"ٹھیک کہتی ہو"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ دو ہزار روپیہ ہے اسی سے کام چلاؤ۔ شادی قانون ہے سزا نہیں ہے۔ قرض لے کر شادی کرنا سراسر بیہودگی ہے"

لکشمی کے دل میں پتہ نہیں کیا کیا خیال جڑ پکڑ چکے تھے۔ ان الفاظ سے اُسے بہت صدمہ پہنچا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ناک کٹاؤ گے"؟

جسونت رائے نے جواب دیا "ہم دینے والے ہیں۔ ہمارا داماد لینے والا ہے۔ جو کچھ ہو سکے گا، دے دینگے۔ لوگوں کا کیا حق ہے کہ خواہ مخواہ دخل درمعقولات کریں"۔

لکشمی نے پھر مایوسی کے انداز سے کہا "ناک کٹاؤ گے"؟

جسونت رائے غصے سے کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور چلّا کر بولے "میں اُن آدمیوں میں سے نہیں ہوں، جو دو گھڑی کی واہ واہ پر اپنی ساری زندگی کی خوشیاں نثار کر دیتے ہیں اور آخر دم تک قرض کے بارسے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ ناک بچاتے ہیں، مگر گردن کٹوا دیتے ہیں۔ برادری میں مونچھوں پر تاؤ دے لیتے ہیں، مگر گھر جا کر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہنستی ہیں مگر دل خون کے آنسو روتا ہے"۔

لکشمی روتے روتے بولی "ہری چند کو جانتے ہو، معمولی کلرک ہے۔ اُس نے اپنی لڑکی کی شادی میں چار ہزار روپیہ خرچ کیا تھا۔ ہم سارا کام دو ہزار میں چلائیں گے؟ جوجی میں ہے کرو، میں عورتوں میں منہ کیسے دکھاؤنگی۔

جسونت رائے کا غصہ اتر گیا۔ لکشمی کے پاس آ کر بولے "پیاری لکشمی صاف صاف کہو۔ تمھاری خواہش کیا ہے"؟

لکشمی نے اُن کا ہاتھ جھٹک کر کہا "پرے ہٹو، مجھے نہ ستاؤ۔ لڑکی تمھاری ہے دھن تمھارا ہے، میں کون ہوں، جو آپ میری خواہش پوچھتے ہو"۔

جسونت رائے ہنس کر بولے "تم میری ہو، میری ملکہ ہو، جو کہو گی کرونگا، مگر اتنا سوچو تو......"

یہاں پہنچ کر جسونت رائے نے پھر سنجیدگی اختیار کر لی۔ "اتنا تو سوچو کہ قرضہ اٹھانے سے فائدہ"؟

لکشمی نے جھوٹ موٹ غصہ دکھاتے ہوئے کہا "فایدہ؟" "ہاں ہاں فایدہ"۔

"فایدہ یہ کہ ناک بچ جائے گی"۔

جسونت رائے نے پھر اپنا طول طویل سرمن شروع کیا اور بڑے زور شور سے اُس پر ثابت کرنا چاہا، کہ ناک کی نسبت گردن زیادہ قیمتی ہے، مگر لکشمی کے دل پر زرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اتنی محنت وہ سنگین سے سنگین مقدمے کا فیصلہ لکھتے وقت بھی صرف نہ کرتے تھے جتنی اس موقع پر کی، مگر لکشمی اپنی بات پر اڑی رہی۔ آخر وہی ہوا جو عموماً ہندو گھرانوں میں بیاہ شادی کے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ کچھ آنسووں نے، کچھ غصے نے، کچھ جھوٹی رکھائی نے، کچھ لاڈ پیار نے مل ملاکر بیوی کو فتح دلا دی۔ جسونت رائے دوسروں کا فیصلہ کرتے وقت سختی کا برتاو کرتے تھے۔ مگر یہاں وہ سختی بہت جلد نرمی میں تبدیل ہوگئی اور ہنس کر کہنے لگے "بہت اچھا حضور! جو آپ کی مرضی ہے وہی ہوگا"

پڑھا لکھا جاہل، جاہل بیوی کے آگے جھک گیا اور اپنے پاوں پر کلہاڑی مارنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

(۳)

لکشمی مُنہ پھلا کر بولی "میں تیری پتی لکشمی دیوی اور میری بات نہ مانی جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا"۔

جسونت رائے کے دل میں پھر خیال آیا، کہ انکار کر دینا چاہیئے۔ مستقل ارادہ کرکے بولے "میں باہر انصاف کرتا رہا ہوں، گھر میں بھی انصاف ہی کرتا رہونگا۔ میں راہ راست سے بھٹک گیا تھا، مگر اب غلطی نہ ہوگی"۔

کہنے کو تو لفظ کہہ دیے، مگر بیوی کا بھولا بھالا چہرا دیکھتے ہی خیال آیا۔ ظالم! غریب عورت کا دل کیوں رنجیدہ کرتا ہے، خود تکلیف اٹھا، مگر اس موم کی پتلی کو رنج نہ پہنچا۔ یہ خیال ایک ساعت میں آیا اور مستقل ارادے کو پھر لپیٹ گیا۔ چہرے پر مسکراہٹ

آ گئی۔ آنکھیں ہنسنے لگیں اور اُٹھ کر بولے "لو میں جاتا ہوں، گھنٹے تک واپس لوٹونگا۔ اجازت ہے؟"

لکشمی آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ پیٹھ سے سہارا لگا کر تحکمانہ انداز سے بولی "آٹھ بجے ہیں۔ نو بجے واپس نہ آئے، تو جرمانہ ہوگا۔"

جسونت رائے ہنستے ہنستے آگے بڑھے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "حضور پہنچ جاؤنگا۔"

یہ کہہ کر باہر نکل گئے اور سوچنے لگے، کیا کرنا چاہیے؟ قرضہ لیے بغیر چارہ نہیں کِتنا سمجھایا، کتنی سردردی کی، مگر اس کی سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں ایک نہیں مانتی۔ آخر یہ قرضہ کیوں لیا جائے۔ لڑکی کی شادی کرنا ہے، یا اپنی بربادی کے سامان فراہم کرنا ہے۔ خوشی جائے گی، اُداسی آئے گی۔ رونق گھٹے گی تکلیف بڑھے گی اور یہ سب کچھ ایک عورت کی (دو گھڑی) کی خوشی کی خاطر ہوگا۔ یہ فضول ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

یہ کہہ کر واپس ہونے کو تھے کہ دل نے دوسرا دفتر کھول دیا "لکشمی سچ مچ لکشمی ہے۔ اُس کے نہ ماں ہے نہ باپ ہے، نہ بہن ہے نہ بھائی ہے، پرماتما نے ایک کھلونا دیا تھا، وہ بھی نہ جانے کہاں گیا اور کیا ہوا۔ یہ لڑکی ہے اب اس کی شادی بھی حسب منشا نہ ہوئی، تو بیچاری کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اُس نے کبھی مجھ سے زیورات کے لیے تقاضا نہیں کیا۔ کبھی قیمتی کپڑوں کا مطالبہ نہیں کیا۔ پہلی دفعہ اُس نے مجھ سے ایک خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر اُس کو بھی پورا نہ کیا تو وہ کیا کہے گی۔ اُس سے کیا کہنا ہے، وہ تو رو دھو کر چپ ہو رہے گی، کیا میرا دل مجھے دن رات نفریں نہ کرتا رہے گا۔"

انہی خیالات میں رائے صاحب تاراچند کی کوٹھی آ گئی۔ رائے صاحب امیر آدمی تھے۔ لاکھوں کی جائداد تھی، روپیہ سود پر دیا کرتے تھے۔ لالہ جسونت رائے ان سے ناخوش رہتے تھے، مگر اس کا اظہار کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ کچہری آتے جاتے روز ان کی کوٹھی کے آگے سے گزرا کرتے تھے، مگر اندر جانے کا کبھی خیال نہیں ہوا۔ کئی دفعہ رائے صاحب نے ان کو

دعوت دی تھی۔ مگر ہر دفعہ لالہ جسونت رائے اُن کو کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتے تھے۔ یہ غرض بڑی بلا ہے۔ آج وہی جسونت رائے ان ہی رائے صاحب کی کوٹھی میں بن بلائے جا رہے تھے۔ کہنے کی ضرورت نہیں، یہی دنیا کا راستہ ہے۔

(۴)

راہ میں جسونت رائے نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مگر کوئی ایسا آدمی دکھائی نہ دیا۔ جو اُن کے اس آڑے وقت میں کام آتا اور دس ہزار روپے کی تھیلی حوالے کر دیتا۔ سوچنے لگے رام سرن داس وکیل روپیہ دے سکتا ہے اور دے بھی دے گا مگر یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو سکتی۔ میرے حضور میں حاضر ہونے والا آدمی اور اُس کے سامنے میری آنکھیں جھک جائیں یا نہیں ہرگز نہیں۔ چلو رائے صاحب سے لینے میں کیا حرج ہے۔ ان سے کبھی بگاڑ تو نہیں ہوا۔ آدمی کنجوس ہے، مگر غرض پوری کر دے گا۔ سود دینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں بنک سے کیوں نہ لے لوں مگر نہیں عوام میں بات اُڑ جائے گی۔ یہی ٹھیک ہے۔ رائے صاحب سود زیادہ لیتا ہے مگر بات باہر نہیں نکالتا۔ اس کا پیٹ کنواں ہے جو بات اندر گئی باہر نہیں نکلتی۔ یہی سوچتے سوچتے رائے صاحب کے کمرے میں جا پہنچے۔ بڈھا کنجوس میلا سا کمبل اوڑھے کاغذوں پر جھکا ہوا حساب کتاب میں مشغول تھا۔ لالہ جسونت رائے کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آج کا دن بڑا مبارک ہے کہ آپ کے درشن ہوئے کرسی پر تشریف رکھیے۔“

لالہ جسونت رائے مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے اور کہنے لگے ”کہیے مزاج تو اچھے ہیں گھر میں تو خیریت ہے؟“

رائے صاحب نے ناک سکوڑ کر جواب دیا۔ ”جی ہاں سب خیریت ہے..... آپ کہیے؟“

”پرماتما کی مہربانی ہے۔“

”کیسے درشن دیئے۔“

"میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ......"

اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکے۔ شرم نے زبان پکڑ لی جب سے ملازم ہوئے تھے کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارا تھا۔ بڈھا خرانٹ آدمی تھا، سب معاملہ سمجھ گیا، مگر انجان بن کر بولا۔ ہاں ہاں"۔ آپ رک کیوں گئے"۔

"جسونت رائے پھر ہمت کر کے بولے "میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے......"

اس سے آگے پھر کچھ کہہ نہ سکے۔ آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ جو چہرہ انصاف پسندی اور راست بازی کے جلال سے چمکتا رہتا تھا، اس پر شرم کے لال بادل دوڑنے لگے، جو سر کبھی کسی کے آگے نہ جھکا تھا، وہ اس موقع پر ایک کنجوس سود خور کے روبرو جھکا ہوا تھا۔ خواہش الفاظ کو زبان تک لاتی تھی مگر شرم انھیں وہیں روک دیتی تھی۔

بڈھا تاراچند کھانس کر بولا "آپ جو بات ہے۔ بلا تکلف کہیے"۔

جسونت رائے نے پھر ہمت کی اور سارا فقرہ کہہ ڈالا میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔

یہ فقرہ زبان سے نکال کر جسونت رائے کو ایسی خوشی ہوئی گویا کوئی مہم فتح کر لی ہے، مگر دوسرے ہی لمحے میں بدن پسینہ پسینہ ہو گیا۔

جسونت رائے پھر بولے "میں سود دینے کو تیار ہوں، مگر رسوائی سے ڈرتا ہوں یہ بات باہر نہ نکلنی چاہیے۔

رائے تاراچند سوچنے لگا، اسامی تو کھری ہے، نقصان کا اندیشہ نہیں مگر سود کم ملے گا؟ اسی دس ہزار کے سود سے چار سال میں مکان بن سکتا ہے، مگر یہ کچہری کی کرسی پر بیٹھنے والا اتنا سود کب دیگا۔ سود نہ بھی آئے کچھ فایدہ تو ہو۔ یہ انصاف کی سیدھ چلنے والا ہے۔ اس سے ایسی امید رکھنا ہی فضول ہے۔ پھر جس سے اپنے آپ کو فایدہ نہ ہو، اسے ہم فایدہ کیوں پہنچائیں۔ اس لیے ٹالنا ہی ٹھیک ہے۔

یہ سب تاراچند نے بہت جلد سوچ لیا اور ہنس کر جواب دیا۔ "دس ہزار کیا بیس ہزار تک حاضر ہے۔"

"مجھے جلد چاہیے۔"

"کب تک ؟"

"ابھی۔"

تاراچند سر ہلاتے ہوئے اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "یہ تو ناممکن ہے۔"

"کل سہی۔"

"کل بھی نہیں۔"

"لڑکی کی شادی میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ سب سامان تیار ہے۔ صرف روپیوں کی کسر ہے۔"

بڈھا رائے صاحب حیرت کے انداز سے بولا "اچھا ؟"

"جی ہاں۔"

"تب تو معاملہ بے ڈھب ہے، روپیہ تیار نہیں ہے۔ اچھا آپ کسی سے لے کر کام چلائیں، پندرہ دن تک میں انتظام کر دونگا۔ رہا سوال سود کا، معاف کیجیے مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی کہ مجھے اس قدر لالچی تصور فرمائینگے۔" یہ کہہ کر کھانسنے لگا۔ کھانسی بھی بڑی اُستاد، عین وقت پر آتی تھی۔

جسونت رائے سناٹے میں آ گئے۔ اُن کو خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ رائے تاراچند سے روپیہ نہ ملے گا۔ آدمی قیافہ شناس تھے، سمجھ گئے، کہ تاراچند کے پاس ہے تو سہی مگر دینا نہیں چاہتا۔ چپ چاپ واپس لوٹے مگر ابھی دروازے سے باہر نہ نکلے تھے کہ ایک اور آدمی کو رائے تاراچند کے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ پنڈت رام داس کا شرابی کبابی فرزند تھا، جو لاکھوں کی جائداد کو تباہ کر رہا تھا اور ہزاروں

کا مال کوڑیوں کے مول میں فروخت کر رہا تھا کہنے کی ضرورت نہیں۔ رائے تارا چند کے پاس اب روپیہ آ گیا تھا تین ہزار روپیے کا پرونوٹ لکھا کر دو ہزار روپیے جب حوالے کر چکا، تو تارا چند کھانس کر بولا :۔

"کہیے میں آپ کے لیے اور کیا کر سکتا ہوں"۔

وہ مہربانی کہہ کر باہر نکل گیا۔

—— (۵) ——

دوسرے دن جسونت رائے ابھی سو کر اٹھے ہی تھے۔ کہ دیکھتے کیا ہیں رائے تارا چند سامنے کھڑا ہے۔ اس کا چہرا گھبرایا ہوا تھا اور آنکھوں سے یاس یا ہر کو جھانک رہی تھی جسونت رائے بولے "کیوں ، رائے صاحب کیا بات ہے"؟

"مجھ پر آفت ٹوٹ پڑی ہے، میں کہیں کا نہیں رہا"۔

"بات کیا ہے"؟

میرے لڑکے رادھے شیام کا چند دن ہوئے سپاہیوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ آج انھوں نے انتقام لینے کے لیے اس پر یہ جھوٹا الزام لگا کر گرفتار کر لیا ہے، کہ وہ اپنے مکان میں جوا کروایا کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں بوڑھی عمر میں یہ الزام میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔ میرے خاندان میں کبھی کسی پر ایسی آفت نہیں ہوئی۔ ہری رام، ہری رام"۔

یہ کہہ کر زار زار رونے لگا۔ ہر چند کہ پہلی رات کو اُس نے جسونت رائے سے بہت برا سلوک کیا تھا، مگر پھر بھی جسونت رائے ایک بڈھے آدمی کو روتے دیکھ کر پگھل گئے اور ہمدردی سے بولے "آپ تسلی رکھیں، آپ کے ساتھ انصاف ہوگا"۔

بڈھا زمین تکتکی باندھ کر ان کی طرف دیکھنے لگا اور بولا "میرا لڑکا چھوٹ جائیگا"

جسونت رائے نے جواب دیا "اگر وہ بے گناہ ہے تو ضرور چھوٹ جائیگا"۔

"ہے تو وہ بالکل بے گناہ، یہ میرا پختہ یقین ہے۔ وہ مرتا مر جائیگا مگر ایسا جرم کبھی

نہ کریگا۔"

"پھر آپ فکر کیوں کرتے ہیں' اُس پر آنچ نہ آئیگی۔"

تارا چند کھانس کر بولا "جہاں آپ کی مہربانی ہے' وہاں فکر کاہے کی۔ بس میری تو تسلی ہو گئی۔"

جسونت رائے بولے "ہاں آپ تسلی رکھیں۔"

تارا چند نے وداع ہوتے وقت کہا "رات آپ نے روپے کا ذکر کیا تھا۔ آپ کو مایوس کر کے ساری رات نیند نہیں آئی۔ گھر میں دس ہزار ہی تھا' آپ کی نذر ہے۔"

یہ کہہ کر دس نوٹ ہزار ہزار کے اس نے جسونت رائے کے آگے رکھ دیے۔

جسونت رائے کی آنکھوں کے آگے سے پردہ سا ہٹ گیا اور انھیں اس نذر کے معنی صاف صاف دکھائی دینے لگے' یہ نذر نہیں رشوت تھی۔

وہ کئی دن سے روپے کے لیے متفکر ہو رہے تھے' انھوں نے ساری رات آنکھ نہ جھپکی تھی۔ وہی روپیہ کاغذوں کی شکل میں اُن کے سامنے پڑا تھا اور اسے وہ قلم کی ایک جنبش کے بدلے حاصل کر سکتے تھے۔ جو دل سخت سے سخت مواقع پر ثابت قدم رہ چکا تھا' وہ ڈانوا ڈول ہو گیا۔ راستبازی قدم جادۂ نیکی سے ڈگمگانے لگے۔ انھوں نے سوچا "ساری دنیا بے ایمان ہے' پھر مجھے ہی ایمان دار رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو راشی ہیں' جو جھوٹے ہیں' جو بدمعاش اور بے ایمان ہیں' اُن کی قسمت کے تارے چمکے ہوئے ہیں' ایک میں ہوں کہ دن رات راستی کا جاپ کرتا رہتا ہوں۔ مگر جیب میں چار پیسے نہیں۔ ست جگ کا زمانہ گیا' اب کل جگ ہے۔ ادھرم کی طرف روشنی اور دھرم کی طرف تاریکی ہے۔ آتنی دیر انصاف کرتے رہے ہیں' مگر کچھ دنوں بے انصافی کرکے بھی دیکھنا چاہیے۔ معمولی بات ہے' لڑکی کی شادی دھوم دھام سے ہو جائیگی' ورنہ سارے جہان کی ہنسی میرے حصے میں ہوگی۔"

اس خیال کے ساتھ ہی تاریکی میں روشنی کا ظہور ہوا۔ دوسرا خیال آیا جسونت رائے تمھاری منصف مزاجی پر لعنت ہے۔ راست بازی کا امتحان خوش حالی میں نہیں، تنگی کے وقت ہوا کرتا ہے۔ نیک نامی بنانے میں برسوں صرف ہوتے ہیں، کالک منٹوں میں لگ جاتی ہے۔ دنیا کا خیال چھوڑ اور دنیا والے کا دھیان کر۔ گناہ آلود روشنی کی نسبت پاکیزگی کی تاریکی زیادہ عمدہ ہے اور اوباشانہ شان وشوکت کی نسبت شریفانہ افلاس زیادہ میٹھا ہے۔ تاریکی آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ بہادر وہی ہے، جو مصیبت میں حوصلہ مند رہے اور ضبط اور راستی کو ہاتھ سے نہ دے۔"

جسونت رائے یہ سوچ رہے تھے اور تاراچند خوش ہو رہا تھا کہ جادو چل گیا! اٹھ کر چلنے لگے اور بولا۔ "اجازت ہے؟"

جسونت رائے نے کہا، "یہ نوٹ لیتے جائیے۔"

تاراچند کو اس کی امید نہ تھی، حیرت سے بولا۔ "کیوں؟"

"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی میں راشی نہیں ہوں۔ ایک زمانہ جانتا ہے۔ میرے ہاتھوں نے حرام کے روپے کو آج تک نہیں چھوا اور نہ میرے قلم نے کبھی وہ لکھا ہے، جسے میں ناروا سمجھتا ہوں۔"

تاراچند بولا۔ "یہ تو قرض ہے۔"

"قرض ہوتا تو رات کو مل جاتا۔"

تاراچند نے اپنے الفاظ پھر دہرائے۔ "یہ تو قرض ہے۔"

جسونت رائے ضبط نہ کر سکے۔ غصّے سے چلّا کر بولے۔ "قرض کیسے ہے؟ قرض ہوتا تو سود مقرر کیے بغیر، اسٹامپ لکھوائے بغیر، تم دس ہزار کی رقم میرے آگے کیسے رکھ دیتے؟ قرض ہوتا، تو اپنے لڑکے کی سفارش کیے بغیر ہی تم مجھے روپیہ رات کو دے دیتے۔ اس

روپیے کی مجھے ضرورت نہیں مہربانی کر کے ان گناہ کے روپیوں کو اٹھا لیجیے۔"
تارا چند سناٹے میں آگیا اور چپ چاپ نوٹ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

(۶)

جسونت رائے اندر گئے۔ لکشمی مسکراتے ہوئے آکر اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بولی "خوش خبری سناؤں۔"

جسونت رائے کا دل دھڑکنے لگا۔ بولے "کیا؟"

"پریم ناتھ یاد ہے؟"

جسونت رائے نے بے تابانہ انداز سے کہا "ہاں کوئی اپنے لڑکے کو بھی بھول سکتا ہے؟"

"وہ آیا ہے۔"

"کہاں؟"

"اندر۔"

جسونت رائے کی فرطِ محبت سے سانس رکنے لگی۔ دوڑتے ہوئے اندر گئے اور برسوں سے گم شدہ بیٹے کو چھاتی سے لگا کر محبت اور خوشی کے آنسو بہانے لگے لکشمی سامنے کھڑی تھی۔ اس وقت اس کی مسرت کا ٹھکانا نہ تھا۔

جسونت رائے نے پوچھا "بیٹا اتنی دیر کہاں رہے۔"

پریم ناتھ نے سر جھکا کر جواب دیا "یہ سب باتیں فرصت کے وقت بیان کروں گا"

لکشمی بات کاٹ کر بولی "اب تو میں جلدی ہی اپنے بیٹے کا بیاہ کر دینا چاہتی ہوں۔ خوب صورت سی بہو اپنے گھر لے آؤں گی۔"

عین اسی وقت نوکر نے آکر کہا "بابو جی نہال چند صاحب باہر کھڑے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

جسونت رائے باہر گئے اور آٹھ دس منٹ کے بعد آکر پریم ناتھ سے بولے "ذرا باہر آؤ"
پریم ناتھ جسونت رائے کے ساتھ گئے اور باہر جاتے ہی تھانے دار صاحب نے ان کو ہتھکڑی پہنا دی۔ جسونت رائے روتے ہوئے اندر لوٹ آئے۔

یکایک لکشمی ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

جسونت رائے منہ سے کچھ بول نہ سکے۔ ان کی انگلی نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔
لکشمی نے پوچھا "بات کیا ہے۔ برسوں کا کھویا ہوا ہیرا ہاتھ آیا تھا اور اُسے تھانے دار پکڑ کے لے گیا ہے۔ آخر اس نے قصور کیا کیا ہے؟"

جسونت رائے کی زبان اب کھل گئی۔ ذرا سنبھل کر بولے "اس پر قتل کا الزام ہے"
"قتل کا الزام؟"
"ہاں ہاں قتل کا الزام"

لکشمی کا دماغ چکرا گیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ گرنے کو تھی کہ کرسی پکڑ کر سنبھلی اور ساتھ ہی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ سوچ کر بولی۔ تھانے دار کو معلوم تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے؟"
"نہیں"
"آپ نے اُسے بتایا نہیں؟"
"نہیں"
"کیوں؟ بتانے میں کیا ہرج تھا؟"
"یہ میرا دل گوارا نہیں کرتا تھا"

لکشمی کے سینے میں گویا کسی نے بھالا مار دیا۔ اس نے غصہ ور ناگن کی مانند سر بلند کیا اور بولی "انصاف اتنا ہی پیارا ہے بیٹے کو پھانسی پر چڑھوا دو گے؟"

جسونت رائے بولے "انصاف کے آگے سب کچھ ہیچ ہے۔"

لکشمی کو امید نہ تھی کہ جسونت رائے یہ جواب دینگے۔ غصہ چھوڑ کر اس نے آنسوؤں کی پناہ ڈھونڈی اور روتے ہوئے جسونت رائے کے قدموں میں گر پڑی "پرماتما کے لیے میرے بچے کو بچاؤ۔"

جسونت رائے بولے "لکشمی!"

"ہاں۔"

"تم جانتی ہو میں نے آج تک انصاف کا خون نہیں کیا۔"

"ہاں۔"

"اور آج ......"

"نہیں! پرماتما کے لیے آج اس انصاف کا سہارا چھوڑ دو۔ جانتے ہو میں اس بچے کے لیے کتنے مہینے روتی رہی تھی۔ آپ خود اس لڑکے کے لیے آج تک اُداس تھے۔ آج ہی وہ ملا تھا اور ابھی کوئی بات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ آپ نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ فرطِ غم سے میرا سینہ پھٹ جائیگا۔"

جسونت رائے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے "لکشمی یہ غم مجھ سے بھی برداشت نہ ہوگا۔ مگر جو کچھ بھی ہو میرے قدم راہِ راست سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ میں نے انصاف کا قلم ہاتھ میں لیا ہے اور انصاف کا عہد کیا ہے اُسے پورا کرونگا اور جس طرح بھی بن پڑیگا اپنے آپ کو بے انصافی کے سیاہ دھبّے سے بچاؤں گا۔ اس کے لیے بیٹے کا نہیں اپنا سر بھی دینا پڑ جائے تو عذر نہ ہوگا۔"

لکشمی نے ایک اور بات سوچی "سرکار خون کے بدلے خون مانگتی ہے؟"

"ہاں خون کے بدلے خون!"

"پھر میں پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار ہوں۔"

جسونت رائے نے بظاہر مسکرا کر کہا "قانون قاتل کا خون مانگتا ہے، قاتل کی ماں نہیں۔"

لکشمی پھر رونے لگی اور روتے روتے بولی "آپ کا دل کیوں پتھر ہو گیا ہے کوئی اس طرح بھی کرتا ہے؟"

"ہاں ہاں منصفوں کو اس ہی طرح کرنا پڑتا ہے۔"

لکشمی کو یقین ہو گیا، کہ بیٹے کا مرنا برحق ہے۔ اس کی نگاہوں میں موت کا نظارہ پھر گیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(۷)

جسونت رائے نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "پرماتما مجھے طاقت دے کہ اس کڑی آزمائش میں ثابت قدم رہ سکوں۔"

وہ بیوی کے بے ہوش جسم کی طرف جھکنے کو تھے، کہ نوکر اندر داخل ہوا اور بولا۔

"تھانے دار صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

جسونت رائے کو تھانے دار صاحب پر بہت غصہ تھا اور ایک طرح پر وہ اسے ہی اپنے بیٹے کا قاتل سمجھ رہے تھے۔ رکھائی سے بولے "جا کر کہہ دو مجھے فرصت نہیں، بیوی بیمار ہے"

لکشمی کو ہوش آ گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی "پرماتما کے لیے میرے بچے کی جان بچاؤ۔"

جسونت رائے نے جواب دیا "لکشمی! مجھے اس آزمائش میں فیل کرنے کی سعی نہ کرو۔"

لکشمی نے انتہائی درجے کے غصے سے منہ پھیر لیا۔ نوکر پھر کمرے میں داخل ہوا۔

"مہاراج! وہ کہتے ہیں، کہ معاملہ بڑا نازک ہے، آپ کا ملنا نہایت ضروری ہے۔"

لکشمی نے کہا "کون ہے؟"

نوکر نے جواب دیا "حضور! تھانے دار صاحب آئے ہیں۔"

لکشمی نے بے تابی سے کہا "اُسے اب کہہ دیجیے۔ ذرا سا بھی اشارہ پا کر وہ اپنے

ثبوت تلف کر دے گا۔"

جسونت رائے نے سر پُر غرور بلند کیا اور بولے "میری زبان یہ الفاظ ادا نہیں کر سکتی"

یہ کہہ کر وہ تھانے دار صاحب سے ملنے کے لیے کمرے سے نکل گئے۔

تھانے دار صاحب بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ وہ بہت نیک آدمی تھے انصاف کی فہرست میں جسونت رائے کے بعد اُن ہی کا نمبر تھا۔ اس لیے دونوں میں بہت الفت تھی۔ جسونت رائے ان کو اپنا بھائی کہا کرتے تھے۔ ہر چند کہ مذہب کی خلیج حائل تھی تاہم اُن کے تعلقات بہت گہرے ہو چکے تھے۔ صرف مردوں میں ہی محبت ہو' یہ بات نہ تھی۔ عورتوں میں بھی محبت کا آغاز ہو چکا تھا۔ تھانے دار صاحب کی بیوی ہفتے میں دو تین بار لکشمی کے ہاں آیا کرتی تھیں۔ جسونت رائے تھانے دار صاحب سے جب ملتے انھیں "مسٹر قمر" کہہ کر بلایا کرتے تھے' تھانے دار کبھی نہ کہتے تھے۔"

قمر الدین آج بہت متعجب ہوئے۔ جب جسونت رائے اُن کے نزدیک آکر بولے۔

" فرمائیے تھانے دار صاحب کیا بات ہے۔"

جواب میں قمر الدین اُن کا منہ دیکھنے لگے۔

جسونت رائے نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور اپنے الفاظ پھر دہرائے "فرمائیے تھانے دار صاحب کیا بات ہے۔"

قمر الدین بولے "آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔"

"نہیں آپ مطلب کی بات کہیے۔ کچہری کا وقت ہو رہا ہے۔"

"آج جو لڑکا آپ کے ہاں چھپا تھا اور جس پر قتل کا الزام ہے' وہ کہتا ہے۔"

جسونت رائے کا دم گھٹنے لگا اور وہ بے صبرے لگے۔ قمر الدین رک گئے۔

"کیا کہتا ہے؟"

"کہ میں ڈپٹی صاحب کا لڑکا ہوں اور وہی ہوں' جو چھ سات سال سے

کہیں گم ہو گیا تھا۔"

جسونت رائے کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ رومال سے اُسے صاف کرتے ہوئے بولے "پھر؟"

قمرالدین نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ٹھیک ہے کیا؟"

جسونت رائے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بولے "مجھے اس بات کا پتا نہیں لگتا، کہ اس بات کا مقدمے سے تعلق ہی کیا ہے۔"

قمرالدین سمجھ گئے کہ پریم ناتھ سچ کہتا ہے۔ مگر ساتھ ہی جسونت رائے کے استقلال اور راست بازی کی انتہائی حد دیکھ کر ان کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ کیسا دل دوز نظارہ تھا۔ بیٹا تلوار کے نیچے گردن دیے ہوئے ہے اور باپ تعلق تک ظاہر کرنے میں پاپ سمجھتا ہے۔

قمرالدین ہمت کر کے بولے "اگر یہ سچ ہے۔ تو کوشش کی جائے کہ...."

جسونت رائے نے چلّا کر کہا "شیطان...." اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں اور دل ہی دل میں قمرالدین کو گالیاں دینے لگے۔

قمرالدین نے جسونت رائے سے کبھی سخت لفظ نہ سنا تھا۔ ملائمت سے بولے "بھائی صاحب! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں قمر ہوں۔"

"تم شیطان ہو۔ لوگوں کو بے ایمانی کے سبق پڑھاتے ہو۔"

قمرالدین پسینہ پسینہ ہو گئے اور زمین کی طرف تکنے لگے۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور رنگینی نکل کر کمرے میں داخل ہو کر قمرالدین کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

وہ پرانے خیال کی عورت تھی۔ پردے کی پابند۔ کبھی باہر نہ نکلی تھی۔ نکلتی تو بند گھی سے [illegible] پیدا کرتی ہیں۔ وہ عام لوگوں سے پردہ کریں یا نہ کریں [illegible] جاتی ہیں [illegible] تھی

...ں تھی۔ وہ جسونت رائے کے دوستوں کا تو سایہ دیکھ کر ہی چھپ جاتی تھی! ایک دفعہ جسونت رائے نے بہت زور دیا، کہ میرے بڑے بھائی سے پردہ نہ کیا کرو۔ اسی بات پر وہ دو دن خفا رہے، مگر لکشمی نے پردہ دور کرنا منظور نہ کیا تھا۔ مگر آج وہی لکشمی، باؤلی ہو کر کھلے سر قمرالدین کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی"۔ تھانے دار صاحب! میں آپ کے سامنے دامن پسارتی ہوں۔ کیا آپ میری جھولی میں بھیک ڈالیں گے؟"

قمرالدین نے ادب کے ساتھ جواب دیا" میری بہن کا جو حکم ہوگا۔ بجا لانے میں عذر نہ ہوگا۔"

آج صبح جس لڑکے کو آپ نے گرفتار کیا ہے۔ وہ میرا لڑکا ہے۔

اس وقت جسونت رائے خاموش تھے۔ اب چپ نہ رہ سکے۔ چلا کر بولے "تم میرے نام کو بدنام کرنے والی کون ہو؟ جس کو میں نے برسوں میں حاصل کیا ہے، تم اسے منٹوں میں مٹی میں ملا دینا چاہتی ہو۔ مہربانی کر کے اندر چلی جاؤ۔

لکشمی نے آج تک خاوند کی حکم عدولی نہ کی تھی، مگر اس وقت بیٹے کی محبت میں وہ دیوانی ہو رہی تھی۔ گرج کر بولی "تم مجھے حکم دینے والے کون ہو؟"

جسونت رائے متعجبانہ انداز سے بولے "یہ بات؟"

"ہاں یہ بات۔"

تب زبردستی ہی کرنا پڑے گا" یہ کہہ کر لکشمی کو زور سے کھینچ کر اندر لے گئے۔ اور ایک کمرے میں بند کر کے جلد جلد واپس آئے۔ قمرالدین ابھی تک بیٹھے تھے۔ ان سے بولے "سنو تھانے دار صاحب! آپ تھانے دار ہیں۔ آپ کا کام انصاف کرنا ہے اور انصاف نہیں دیکھتا، کہ ملزم کس کا رشتہ دار ہے اور کون ہے؟ بلکہ یہ کہ جرم کی نوعیت کیا ہے اور یہ کہ جرم اس سے سرزد ہوا ہے یا نہیں؟ پریم تو میرا لڑکا ہے، اگر اس نے قتل کیا ہے، تو میں اس کے بچاؤ کی سفارش نہ کرتا ہوں [illegible] ہوں گا۔ آپ سے بھی

میری یہ عرض ہے، کہ آپ نے آج تک انصاف کیا ہے۔ آیندہ کے لیے بھی مقصود کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ میری بیوی نے جو کچھ کہا ہے، اُس کا خیال نہ کریں، وہ اس وقت پاگل ہو رہی ہے۔"

قمرالدین کی آنکھوں میں آنسو بھر آیے۔ دنیا میں انصاف کے لینے والے بہت ہیں۔ انصاف کرنے کے مدعی لاتعداد ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو آزمایش میں پورے اُترتے ہیں، جو امتحان کے وقت ہمت نہیں ہارتے، جو تاریکی کے وقت پاؤں کو ڈگمگانے نہیں دیتے۔ ایسے سچے بہادر کتنے ہیں۔

وہ کھڑے ہو کر بولے۔ "آپ مبارک ہیں۔"

جسونت رائے نے جواب دیا "دعا کرو۔ خدا اس آزمایش میں پورا اُترنے کی توفیق دے۔"

(۸)

دوسرے دن رادھے شیام کا مقدمہ جسونت رائے کی عدالت میں سماعت کے لیے پیش ہوا۔ رائے تاراچند کو یقین ہو گیا کہ اب رہائی ناممکن ہے۔ کسی اور ڈپٹی کے ہاں ہوتا، تو بچاؤ کی سبیل ہو سکتی تھی۔ مگر جسونت رائے سخت آدمی۔ اس پر بات بگڑی ہوئی، کوئی امید دکھائی نہ دی۔ ناؤ ٹوٹی ہوئی ہو، پانی زوروں پر ہو، ملاح مخالف ہو، تو بچاؤ کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ خیال آیا مقدمہ دوسری عدالت میں منتقل کرا لیں۔ لیکن پھر سوچا۔ پولیس نے جعلی مقدمہ بنایا ہے دیکھیں انصاف ہوتا ہے یا نہیں۔ جسونت رائے غیر جانب دار مقدموں میں دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ میری اور ان کی ظاہرا چھڑی ہوئی ہے۔ یہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، کہ انصاف کی بھیک دشمن کی جھولی میں ڈالتے ہیں یا نہیں۔

مقدمہ پیش ہوا اور وکیل وعدۂ معشوق کی مانند پیشیاں بھگتنے لگے۔ پولیس
شہادت زبردست تھی۔ انھوں نے گواہوں کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔ لیکن
جسونت رائے کے رعب نے ان کو آن واحد میں راہ راست پر لگا دیا۔ شہادت
صاف ہوگئی، مگر اس کی کسر سرکاری وکیل نے نکال دی اور وہ زبردست
لیتہ الآرا تقریر کی، کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اور ان کو یقین ہوگیا کہ رادھے شیام کا
اقطعی ناممکن ہے۔

لیکن جسونت رائے سمجھ گئے تھے، کہ اصلیت کیا ہے اور راستی کس کی طرف
انھوں نے فیصلہ لکھنا شروع کیا اور اٹھ کر سنا دیا۔ ثبوت کمزور ہے۔ ملزم بری۔
اُدھر پریم ناتھ کو ۱۴ سال کالے پانی کی سزا ملی۔

(۹)

رائے تارا چند کو یہ توقع نہ تھی، مگر جس شخص نے اپنے بیٹے کے لیے انصاف کو
پڑا تھا وہ کینے کی خاطر کیونکر ممکن تھا، کہ راہِ راست سے متزلزل ہو جاتا۔ جس
فیصلہ ہوا اُسی دن رائے تارا چند اُن کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "آپ آدمی
ں دیوتا ہیں۔"

جسونت رائے نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ آزمایش ہے جس میں مَیں نے تا حال
ساف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ پرماتما کرے اس آزمایش کے عرصۂ طویل
میرے پایۂ استقلال کو لغزش نہ آئے۔"

تارا چند بولا! آپ نے روپیوں کی ضرورت ظاہر فرمائی تھی مجھے افسوس ہے
نے اُس وقت انکار کیا۔ اب جس وقت کہیں حاضر کردوں۔

جسونت رائے نے جواب دیا۔ "جو شخص انصاف کی خاطر بیٹے کو قربان کر سکتا
ہ اصول کی خاطر جھوٹی بدنامی بھی سہہ سکتا ہے میرے پاس جو کچھ ہے۔ اُسی میں

شادی کر دوں گا، قرض لینے کی اب خواہش نہیں رہی اور ویسے بھی ابھی غم کے
شادی جلد نہیں ہو گی۔"

رائے تارا چند یہ سن کر چپ چاپ چلا گیا۔ لکشمی چک کے اندر سے تمام با
سن رہی تھی۔ تارا چند کے چلے جانے پر آ کر جسونت رائے کے پاؤں میں گر پڑی او
بولی "معاف کریں، میں نے آپ کو آج تک نہ سمجھا تھا۔ اب آنکھوں سے پردہ ہٹ
اور آپ کی عظمت کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں بیوقوف تھی اب آئندہ سے
غلطی نہ ہو گی۔ بیٹا ۱۴ سال کے لیے دے کر اور بیٹی کی شادی اپنے حسب مقدو
بھی مجھے فخر و ناز رہے گا کہ میں نے آپ جیسا نیک سیرت خاوند پایا ہے۔"

جسونت رائے نے بھرائی ہوئی آواز سے جواب دیا "لکشمی! یہ صدمہ
سخت ہے اور وقت طویل۔ اگر تم میری امداد نہ کرو گی تو استقلال قائم رہنا مش

لکشمی بولی "اگر وقت گھڑیوں کی سوئیوں کے ماتحت ہوتا۔ تو میں چودہ
بہت جلد گزار دیتی۔ مگر یہ نہ ہوا ہے نہ ہو گا۔ اس لیے پرماتما پر بھروسا رکھو او
کو سنبھالو۔ گھبرانے سے آن جاتی رہے گی۔